زندگی کے عام فقہی مسائل

جلد دوم

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ترتیب

پیش لفظ ۷

فقہی مسائل

۱- بے وضو مصحف چھونے کا مسئلہ ۹

۲- قرآن کے بوسیدہ اوراق کے ساتھ کیا کیا جائے؟ ۱۲

۳- جنابت کی حالت میں صبح کرنا ۱۴

۴- اگر کسی عذر سے وقت پر نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو... ۱۶

۵- چھوٹی ہوئی نمازوں کا کفارہ؟ ۱۹

۶- نماز یا دینی اجتماع کے لیے مساجد میں عورتوں کی حاضری ۲۰

۷- نماز وتر کا وقت ۲۷

۸- ماہ رمضان میں نماز وتر کی انفرادی ادائی ۳۰

۹- بیماری کی بنا پر روزہ رکھنے سے معذوری ۳۱

۱۰- روزوں کی قضا کا مسئلہ ۳۴

۱۱- رمضان میں امام مسجد کو بونس ۳۷

۱۲- نماز تراویح کا مخصوص طریقہ ۳۸

۱۳- تعمیر مسجد میں غیر مسلم کا مالی تعاون ۴۱

۱۴-	تدفین کے وقت قبر پر مٹی ڈالنا	۴۲
۱۵-	رقم زکوٰۃ سے اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائی	۴۳
۱۶-	کیا حج سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں؟	۴۸
۱۷-	حج بدل	۵۲
۱۸-	قربانی کے بعض مسائل	۵۳
۱۹-	شادی کی رسمیں	۵۶
۲۰-	مصنوعی استقرارِ حمل	۵۸
۲۱-	ناقص الخلقت جنین کا اسقاط	۶۰
۲۲-	ازدواجی تعلقات اور حقوق	۶۲
۲۳-	بگڑے ہوئے شوہر کی اصلاح کا صحیح طریقہ	۶۵
۲۴-	نومولود کے کان میں اذان دینا	۷۴
۲۵-	کیا عقیقہ میں بال مونڈنا ضروری ہے؟	۷۵
۲۶-	بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا حق	۷۶
۲۷-	نقلِ مکانی کی صورت میں عورت کا حقِ حضانت	۸۷
۲۸-	اگر ماں باپ کے حکم میں اختلاف ہو...	۸۹
۲۹-	دھوکا اور طلاق	۹۲
۳۰-	بوڑھوں کے لیے رفاہی اداروں کا قیام	۹۳
۳۱-	اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھ لے؟	۹۷
۳۲-	ملکیت کا مسئلہ	۱۰۰
۳۳-	حق وراثت حاصل کرنے کے لیے لڑائی جھگڑا کرنا	۱۰۵
۳۴-	میراث کے چند مسائل	۱۰۸
۳۵-	مردوں کے لیے عورتوں سے علمی استفادہ	۱۱۲
۳۶-	تحریکی خواتین کا دائرۂ عمل	۱۱۵

۳۷- چہرہ اور آواز کا پردہ: معتدل نقطۂ نظر ۱۲۵
۳۸- کیا غیر مسلم ملک میں سودی لین دین جائز ہے؟ ۱۳۵
۳۹- سودی کاروبار کرنے والے کی دعوت قبول کرنا ۱۳۸
۴۰- کالے خضاب کی شرعی حیثیت ۱۴۰
۴۱- عورتوں کے لیے سونے کا استعمال ۱۴۳
۴۲- انگوٹھی میں پتھر کا استعمال ۱۵۲
۴۳- موقع و محل سے تھوڑی بے ایمانی کی چھوٹ ۱۵۴
۴۴- پریشانیوں کے ہجوم میں مومنِ صادق کا مطلوبہ رویّہ ۱۵۸

علمی مسائل

۴۵- سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہ پڑھی جائے؟ ۱۶۳
۴۶- قرآنی بیانات میں اختلاف و تضاد؟ ۱۶۶
۴۷- علم غیب کی کنجیاں ۱۶۹
۴۸- قصصِ یوسفؑ و سلیمانؑ کے بعض اشکالات ۱۷۴
۴۹- بائبل کے مشتملات ۱۸۲
۵۰- کیا رسول اللہ ﷺ کا مشن لوگوں کو بہ جبر مسلمان بنانا تھا؟ ۱۸۳
۵۱- ضعیف اور موضوع احادیث ۱۹۱
۵۲- حدیثِ نبوی کی صحت و عدمِ صحت کی پہچان ۱۹۴
۵۳- ایک فرقہ کو جنتی اور دیگر فرقوں کو جہنمی بتانے والی حدیث صحیح ہے ۱۹۶
۵۴- گم راہ فرقے اور سزائے جہنم ۱۹۹
۵۵- رسول اللہ ﷺ کی طبعی نظافت
۵۶- بعض احادیث پر اشکالات ۲۰۵
۵۷- تشخص کا مسئلہ ۲۱۴

۵۸- معرکۂ قسطنطنیہ میں حضرت یزید کی سربراہی ۲۲۰
۵۹- صحابۂ کرام کے کرداروں پر مبنی اداکاری ۲۳۰
۶۰- طبی اخلاقیات ۲۳۱
۶۱- مریض سے مصنوعی تنفس کے آلات کب ہٹائے جاسکتے ہیں؟ ۲۳۶

پیش لفظ

ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی میں فقہی استفسارات، رسائل ومسائل کے کالم میں شائع ہونے والے سوالات و جوابات کا ایک مجموعہ اس سے پہلے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے 'زندگی کے عام فقہی مسائل' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔اب یہ دوسرا مجموعہ پیش خدمت ہے۔

اس میں جن سوالات کے جوابات شامل ہیں وہ انسانی زندگی میں عام طور سے در پیش رہتے ہیں۔ان جوابات میں 'فتویٰ' کی زبان سے عموماً گریز کیا گیا ہے۔مسئلہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور علمائے سلف اور فقہائے کرام کی آراء کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔کچھ سوالات آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے متعلق اشکالات، سیرتِ رسول ﷺ، سیرتِ صحابہ، تاریخ اسلامی اور دیگر علمی موضوعات سے متعلق ہیں۔ان کے جوابات کو بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

امید ہے، اس مجموعہ سے روز مرّہ کی زندگی میں پیش آنے والی بہت سی الجھنوں اور مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کا فائدہ عام کرے اور اس کے اجر سے نوازے۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ — محمد رضی الاسلام ندوی

۱۴؍جون ۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بے وضو مصحف چھونے کا مسئلہ

سوال: مولانا مودودیؒ نے آیت لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ علامہ ابن حزمؒ نے مدلل لکھا ہے کہ بے وضو قرآن شریف کو چھو سکتا ہے۔ عرض ہے کہ ان کے کیا دلائل ہیں؟ انھیں تفصیل سے بیان کردیں، تاکہ مجھ جیسے معذور کے لیے گنجائش نکل آئے۔ میری عمر اس وقت ۹۲ سال چال رہی ہے۔ پیشاب کی کثرت اور دیگر عوارض قرآن کی تلاوت میں مانع ہوتے ہیں۔ الحمدللہ میں حافظِ قرآن ہوں۔ چالیس سال تراویح میں قرآن سناتا رہا ہوں۔ اب حافظہ بہت کم زور ہوگیا ہے۔ دیکھ کر پڑھنے پر مجبور ہوں۔

واضح رہے کہ میں حیلہ نہیں تلاش کر رہا ہوں۔ اسلام میں جب گنجائش ہے تو کیوں نہ اس پر عمل کیا جائے۔

جواب: فقہاء نے حدثِ اکبر (جنابت، حیض، نفاس) اور حدثِ اصغر (بے وضو ہونا) کی صورت میں مصحف چھونے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ابنِ قدامہؒ فرماتے ہیں: داؤد ظاہریؒ کے علاوہ اور کسی فقیہ نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ ان کا استدلال قرآن کریم کی اس آیت سے ہے: لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:۷۹) (اسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا) اسی طرح ان کا استدلال بعض احادیث سے بھی ہے۔ مثلاً اللہ کے رسول ﷺ نے اہلِ یمن کے لیے جو احکام حضرت عمرو بن حزمؓ کو لکھوا کر دیے تھے ان میں یہ حکم بھی تھا: لا یمس القرآن الا طاهر (کوئی شخص قرآن کو نہ چھوئے مگر طاہر)

اس حدیث کی تخریج دارمی اور دارقطنی نے کی ہے اور اسحاق بن راہویہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اسی مضمون کی حدیث حضرت ابنِ عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ اس کی تخریج طبرانی نے المعجم الکبیر میں کی ہے اور حافظ ابنِ حجر نے التلخیص میں اس کی سند کو قابلِ قبول (لا باس به) قرار دیا ہے۔ (الموسوعة الفقهية، کویت، ۳۸/۵-۶)

مولانا مودودیؒ نے اس موضوع پر آیتِ مذکور کی تفسیر کے ضمن میں مفصل بحث کی ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد پنجم، ص: ۲۹۱-۲۹۵، سورہ واقعہ، حاشیہ: ۳۹) انھوں نے اس مسئلے میں مذکور روایات، صحابہ وتابعین کے اقوال وآراء اور فقہا کے مسائل تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ آیت کے تعلق سے ان کا کہنا یہ ہے کہ اس میں ناپاکی کی حالت میں قرآن نہ چھونے کا حکم نہیں بیان کیا گیا ہے۔ آیت میں مطہرون سے مراد فرشتے ہیں۔ البتہ وہ فرماتے ہیں: ''زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ آیت یہ حکم دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے، مگر فحوائے کلام اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کتاب کو صرف مطہرین ہی چھو سکتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی کم از کم وہ لوگ جو اس کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اسے ناپاکی کی حالت میں چھونے سے اجتناب کریں۔ (تفہیم القرآن، ۵/۲۹۲)

آخر میں انھوں نے ظاہریہ کا مسلک بیان کردیا ہے: ''ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن پڑھنا اور اس کو ہاتھ لگانا ہر حال میں جائز ہے، خواہ آدمی بے وضو ہو، یا جنابت کی حالت میں ہو، یا عورت حیض کی حالت میں ہو۔ ابن حزمؒ نے المحلی (جلد اول، ص: ۷۷ تا ۸۴) میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے، جس میں انھوں نے اس مسلک کی صحت کے دلائل دیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ فقہاء نے قرآن پڑھنے اور اس کو ہاتھ لگانے کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں، ان میں سے کوئی بھی قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے۔'' (تفہیم القرآن، ۵/۲۹۵)

اس موضوع پر علامہ ابن حزمؒ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ناپاکی کی حالت میں مسِ مصحف ناجائز بتانے والی تمام روایات مرسل، غیر مسند یا مجہول یا ضعیف راویوں سے مروی ہیں۔ دوسری جانب ایک صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قیصرِ روم ہرقل کو جو خط لکھا تھا اس میں ایک آیت بھی درج تھی۔ سورۂ واقعہ کی آیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

کہ وہ مذکور حکم سے متعلق نہیں ہے۔ بل کہ اس میں مطہرون سے مراد فرشتے ہیں، جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے۔

علامہ ابنِ حزمؒ نے آگے لکھا ہے کہ اگر مصحف کپڑے یا کسی اور چیز میں لپٹا ہوا ہوتو امام ابوحنیفہؒ جنبی اور بے وضو شخص کے لیے اسے چھونے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ امام مالکؒ اس صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ البتہ اگر وہ کسی موٹے جزدان یا تابوت میں رکھا ہوا ہوتو جنبی اور بے وضو شخص کے لیے اسے اٹھانے کو جائز کہتے ہیں۔ ابنِ حزمؒ کہتے ہیں کہ اس فرق کی تائید نہ قرآن کی کسی آیت سے ہوتی ہے، نہ کسی صحیح یا کم زور حدیث سے، نہ اجماع یا قیاس سے۔

(المحلی، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر ۱۳۴۷ھ، ۱/ ۸۱-۸۴)

علامہ ابنِ حزمؒ اپنی بہت سی آراء میں منفرد ہیں۔ ان کی یہ بات صحیح نہیں کہ ناپاکی کی حالت میں مسِ مصحف کو ناجائز بتانے والی کوئی حدیث صحیح نہیں۔ ابتدا میں حضرت عمرو بن حزمؓ سے مروی جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ اگرچہ مؤطا امام مالک میں مرسلاً مروی ہے، لیکن بعض دوسری سندوں سے اس کا متصل اور صحیح ہونا ثابت ہے۔ المحلی لابن حزم کے محقق علامہ احمد محمد شاکرؒ نے لکھا ہے: ''حضرت عمرو بن حزمؓ سے مروی اس مکتوبِ نبوی کے تمام الفاظ کی میں نے تحقیق کرنی چاہی تو توفیقِ الٰہی سے میں اس میں کام یاب ہوگیا۔ میں نے پایا کہ مکمل روایت کی تخریج حاکمؒ نے المستدرک (جلد اول، ص ۳۹۵، طبع الہند) میں متصل سند سے کی ہے (احمد محمد شاکر نے پوری سند نقل کی ہے) اور روایت کا کچھ حصہ اسی سند سے نسائی، ابنِ حبان، دارقطنی اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ یہ سند صحیح ہے۔ الحمدللہ میں نے التحقیق لابن الجوزی پر اپنی شرح (جلد اول، ص: ۹۷، مسئلہ نمبر: ۴۲) میں سند کی صحت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔'' (المحلی، ۱/ ۸۲، حاشیہ از احمد محمد شاکر)

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ عام حالات میں عام افراد کے لیے حکم ہے۔ عذر کی صورت میں بے وضو مصحف چھونے کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ مثلاً فقہا نے چھوٹے بچوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ تعلیم القرآن کے لیے وہ بے وضو اسے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں کو بار بار پیشاب ہونے کا عذر ہو، یا کسی اور سبب سے ان کا وضو دیر پا نہ رہتا ہو ان کے لیے گنجائش ہے۔ وہ وضو کر کے قرآن پڑھنا شروع کریں اور ایک نشست میں جتنی دیر چاہیں اس میں مشغول رہیں، خواہ درمیان میں ان کا وضو ٹوٹ گیا ہو۔

قرآن کے بوسیدہ اوراق کے ساتھ کیا کیا جائے؟

سوال: گزشتہ دنوں اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ ممبرا کے ایک علاقے میں قرآن کے اوراق کوڑے دان میں ملتے ہیں اور کوڑا چننے والی ایک غیر مسلم عورت انھیں جمع کر کے ایک مسلمان دوکان دار کو دیتی ہے۔ یہ کام وہ نیکی سمجھ کر کرتی ہے۔ مسلم اکثریت والے علاقے میں یہ کام مسلمانوں کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے ان مسلمانوں پر جو دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآن کے اوراق کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں۔

اس موقع پر بعض علما کی طرف سے یہ اپیل شائع کی گئی کہ اگر قرآن کے بوسیدہ اوراق کو ضائع کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو انھیں زمین میں دفن کر دیا جائے یا سمندر میں پھینک دیا جائے۔ مگر یہ معلوم ہے کہ سمندر کوئی چیز اپنے پیٹ میں نہیں رکھتا۔ اسے واپس کنارے پر لگا دیتا ہے۔ یعنی پھر وہی بے حرمتی۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کا کوئی بہتر حل ہمیں بتائیں۔ صحابۂ کرامؓ کے دور میں بھی ایسا مسئلہ پیش آیا ہوگا۔ انھوں نے اس وقت کیا رویہ اختیار کیا تھا؟ امید ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں گے۔

جواب: قرآنِ کریم کا کوئی نسخہ یا اس کے کچھ اوراق اتنے بوسیدہ ہو جائیں کہ ان سے استفادہ ممکن نہ ہو تو انھیں ادھر ادھر نہ پھینکا جائے اور نہ ان کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کیا جائے جس سے بے حرمتی ہو۔ علما نے اس کے لیے مختلف طریقوں کی نشان دہی کی ہے۔

احناف اور حنابلہ کہتے ہیں کہ کوئی مصحف بوسیدہ ہو جائے تو اسے کسی ایسی جگہ دفن کر دینا چاہیے، جسے پیروں سے روندا نہ جاتا ہو، تاکہ بے حرمتی نہ ہو۔ امام احمدؒ نے تابعی ابو الجوزاءؒ (م ۸۳ھ) کے متعلق نقل کیا ہے کہ ان کا مصحفِ قرآن بوسیدہ ہو گیا تو انھوں نے اپنی مسجد میں ایک گڑھا کھود کر اس میں دفن کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے بارے میں ایک روایت ہے کہ انھوں نے قرآن کے کچھ مصاحف مسجد نبوی میں منبر اور قبرِ نبوی کے درمیان دفن کروا دیے تھے۔ احناف کہتے ہیں کہ بوسیدہ نسخوں کو آگ میں جلا دینا جائز نہیں ہے۔ یہی قول ابراہیم نخعیؒ سے بھی مروی

ہے۔شوافع میں سے قاضی حسینؒ کا بھی یہی خیال ہے۔امام نوویؒ جلانے کو مکروہ کہتے ہیں۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ بوسیدہ نسخوں کو جلا دینا جائز، بل کہ بسا اوقات ضروری ہے۔تاکہ ان کی بے حرمتی نہ ہو اور وہ پیروں سے روندے جانے سے محفوظ رہیں۔امام قرطبی مالکیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ایسا ہی کیا تھا اور تمام صحابۂ کرامؓ نے ان کی تائید کی تھی۔

(الموسوعة الفقهية، طبع کویت، ۲۸/ ۲۳)

حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہدِ خلافت میں اسی طرح کی صورتِ حال پیش آئی تھی تو انھوں نے قرآن کے نسخوں کو جلا دینے کا موقف اختیار کیا تھا اور تمام صحابہ کرامؓ نے ان کی تصویب کی تھی۔قرأتِ قرآن کے معاملے میں جب اختلافات سامنے آنے لگے تو انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جمع کردہ نسخۂ قرآن کو، جو ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ تھا، منگوایا۔ اس کے متعدد نسخے تیار کروا کے مملکتِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں میں بھجوا دیے اور صحابہ کرام کے پاس ان کے جو ذاتی نسخے تھے، سب کو جمع کروا کے جلوا دیا۔امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس سلسلے کی جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

فارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا و امر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق۔

(صحيح بخارى، كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حديث: ٤٩٨٧)

”کاتبین قرآن نے جو نسخے تیار کیے تھے، ان میں سے ایک ایک مصحف انھوں نے ہر علاقے میں بھجوا دیا، اور ان کے علاوہ قرآن جن صحیفوں یا مصاحف میں لکھا ہوا تھا، سب کو جلوا دیا۔“

علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے: ”حضرت عثمانؓ نے یہ کام مہاجرین، انصار اور دیگر مسلمانوں کو اکٹھا کر کے اور ان سے مشورہ کرنے کے بعد کیا تھا۔وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ قرآن کا ایک صحیح نسخہ تیار کر کے، دیگر نسخوں کو ضائع کر دیا جائے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی رائے کی تصویب کی تھی۔ بلاشبہ ان کی رائے درست اور تائیدِ الٰہی سے بہرہ ور تھی۔“

(تفسیر قرطبی، طبع مصر، ۱۹۸۷ء، ۱/ ۵۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں جب حضرت عثمانؓ پر بعض حلقوں سے تنقیدیں ہونے لگیں تو ان کے اس عمل کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس وقت حضرت علی بن ابی طالبؓ نے کھل کر ان کی حمایت کی۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

''لوگو! اللہ سے ڈرو۔ عثمانؓ کے معاملے میں غلو نہ کرو۔ انھیں قرآن جلانے والا نہ کہو، اللہ کی قسم! انھوں نے ہم تمام اصحابِ محمد ﷺ سے مشورہ کرنے کے بعد ایسا کیا تھا۔''

(تفسیر قرطبی، ۱/ ۵۴)

اسی طرح ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

''اگر اس وقت میں خلیفہ ہوتا تو ان دیگر مصاحف کے ساتھ میں بھی وہی کرتا جو عثمانؓ نے کیا۔'' (تفسیر قرطبی، ۱/ ۵۴)

محدث ابن بطال فرماتے ہیں: ''حضرت عثمانؓ نے مصاحف جلوا دیے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کتابوں میں اللہ کا نام لکھا ہو، انھیں جلایا جاسکتا ہے۔ اس سے ان کی بے حرمتی نہیں ہوگی۔ انھیں پیروں سے نہ روندا جائے گا اور وہ زمین میں ادھر ادھر نہیں پڑے رہیں گے۔'' (ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، دار المعرفۃ بیروت، ۹/ ۲۱، تفسیر قرطبی، ۱/ ۵۴)

حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت طاؤس کی بھی یہی رائے ہے۔ قرطبیؒ نے بھی اسی کو بہتر قرار دیا ہے۔ (فتح الباری، ۹/ ۲۱، تفسیر قرطبی، ۱/ ۵۴-۵۵)

آپ کی رائے درست ہے کہ دریا یا سمندر میں قرآن کے بوسیدہ اوراق کو بہا دینے سے مذکورہ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ بہہ کر کنارے لگ جائیں گے اور پھر ان کی بے حرمتی ہوگی۔ اس لیے زمین میں دفن کر دینے یا آگ میں جلا دینے میں سے جو طریقہ مناسب معلوم ہو، اسے اختیار کرنا چاہیے۔

جنابت کی حالت میں صبح کرنا

سوال: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع شدہ کتاب 'فقہ السنہ' میں روزوں کے ذیل میں بہ عنوان 'جنابت کی حالت میں صبح کرنا' ایک حدیث پیش کی گئی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

'حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے، حالاں کہ آپؐ روزے سے ہوتے تھے، پھر آپ غسل فرماتے'۔ (بہ حوالہ: بخاری و مسلم، ص: ۳۸۴)

اس حدیث کو پڑھ کر فوراً ہی یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ کیا نبی ﷺ حالتِ مذکور میں فجر کی نماز ترک کر دیتے تھے؟ جنابت خواہ مباشرت کے ذریعے ہوئی ہو یا احتلام کے ذریعے، اس حالت میں روزہ رکھ لینا اور پھر فجر کی نماز ترک کر کے صبح کر دینا ایسا عمل ہے، جس کی توقع اللہ کے عام نیک بندوں سے بھی نہیں کی جا سکتی، چہ جائے کہ اسے اللہ کے محبوب ترین پیغمبر سے منسوب کیا جائے۔ ایک شکل یہ تو ہو سکتی ہے کہ فجر کی نماز کے بعد انسان سو جائے اور حالت خواب میں وہ ناپاک ہو جائے، لیکن حدیث کے الفاظ 'جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے' اس بات کی صراحت کر رہے ہیں کہ حالتِ جنابت کا وقوع رات میں ہوا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کتاب مذکور میں زیر بحث حدیث کے ضمن میں حاشیے میں فقہا کی جو آرا دی گئی ہیں، ان میں بھی اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، جب کہ حدیث مذکور کو درست مان لینے سے نبی ﷺ سے قصداً ترکِ نماز کا عمل ثابت ہوتا ہے، جو کہ میری دانست میں نبی ﷺ پر ایک سنگین الزام ہے۔

جواب: اس خط سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں بعض مسلمانوں کے ذہنوں پر عقلیت پسندی کس حد تک غالب آ گئی ہے؟ اور وہ دین کے نصوص پر کس انداز سے غور کرنے لگے ہیں۔ کوئی حدیث چاہے کتنی ہی بے غبار ہو اور چاہے وہ معتبر راویوں سے مروی اور حدیث کی مستند کتابوں میں درج ہو، لیکن اگر وہ کسی کے عقلی چوکھٹے میں فٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس شخص کو اسے نادرست قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا اور وہ بلا جھجک یہ فیصلہ کر بیٹھتا ہے کہ اس میں نبی ﷺ پر ایک سنگین الزام لگایا گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اپنے استنباط پر نظر ثانی کی جائے اور اپنے فہم کو قصوروار قرار دیا جائے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''نبی ﷺ جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے۔'' اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آپؐ آٹھ بجے صبح سو کر اٹھتے تھے۔ طلوعِ فجر کے وقت کو بھی 'صبح' کہتے ہیں۔ اس کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک ایک گھنٹہ سے زائد وقت رہتا ہے۔ اس عرصے میں کسی بھی وقت فجر کی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی امت کے تمام افراد کے لیے اسوہ ہے۔ بہت سے کام آپؐ نے بیان جواز کے لیے کیے ہیں اور امہات المومنین نے ان کی روایت بھی اسی مقصد سے کی ہے کہ افرادِ امت کو معلوم ہو جائے کہ فلاں کام میں جواز کی حد کہاں تک ہے۔ کیا اگر کوئی شخص رات میں جنبی ہو جائے تو اس کے لیے فوراً اٹھ کر غسل کرنا واجب ہے؟ یا وہ رات کا بقیہ حصہ اسی حالت میں گزار کر، صبح نمازِ فجر سے قبل غسل کر سکتا ہے؟ رسول ﷺ کے اس عمل نے ہم جیسے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے لیے سہولت کی راہ دکھائی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مسجد نبوی میں آپؐ ہی امامت کرتے تھے۔ کبھی کسی وجہ سے آپؐ کو مسجد میں آنے میں تاخیر ہو جاتی تو صحابۂ کرام آپؐ کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ایک وقت کی نماز کے بارے میں بھی (سوائے مرض الموت کے) یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ مسجد نبوی سے متصل اپنے گھر میں رہے ہوں اور آپؐ نے مسجد میں آ کر صحابہ کی امامت نہ کی ہو۔

اگر کسی عذر سے وقت پر نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو...

سوال: میں ایک سرکاری بس ڈپو کے ورک شاپ میں میکنیک کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ ورک شاپ میں آنے والی ہر بس کو چیک کرنا اور اگر اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی خرابی ہو تو اسے ٹھیک کرنا میری ذمہ داری ہے۔ کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں صاف کپڑے بدل کر میلے کچیلے کپڑے پہن لیتا ہوں۔ شام کے وقت ڈپو میں آنے والی بسوں کا رش ہوتا ہے۔ اگر میں تھوڑی دیر کے لیے بھی وہاں سے ہٹ جاؤں تو بسوں کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہنگامہ اور افسران ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگتے ہیں اور ڈیوٹی سے غفلت اور بے پروائی کا قصوروار قرار دینے لگتے ہیں۔ اس بنا پر میری عصر اور مغرب کی نمازیں مسلسل قضا ہوتی ہیں۔ میں اتنا وقت بھی نہیں نکال پاتا کہ جا کر میلے کپڑے بدلوں، صاف کپڑے پہنوں، وضو کر کے نماز پڑھوں، پھر میلے کپڑے پہن کر کام پر واپس لوٹ سکوں۔

واضح کر دوں کہ میرے پاس انجینئرنگ کی ڈگری ہے، لیکن مجھے کام اس معیار کا نہیں مل سکا ہے۔ میں اپنے افسروں سے برابر کہتا رہتا ہوں کہ میری علمی قابلیت کے لحاظ سے مجھے کام دیں۔ میں یہ بھی کہتا رہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی دوسرا دفتری یا غیر دفتری کام لیں، جس سے مجھے کچھ

موقع مل جایا کرے اور میری نمازیں قضا نہ ہوں۔ لیکن اب تک کوئی صورت نہیں بن سکی ہے۔ مسلسل نمازیں قضا ہونے کی وجہ سے میں سخت الجھن میں ہوں۔ میرے حلقۂ احباب میں بعض لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ میں ایسی ملازمت چھوڑ دوں جس میں نمازوں کی ادائی میں رکاوٹ ہو، جب کہ بعض احباب کہتے ہیں کہ بیوی بچوں کی کفالت بھی فرض ہے۔ اس لیے کوئی ایسا اقدام درست نہیں، جس سے وہ پریشانی میں پڑ جائیں۔ بہ راہِ کرم مجھے مشورہ دیں، میں کیا کروں؟

جواب: عام حالات میں پنج وقتہ نمازوں کی ادائی ان کے اوقات میں ضروری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا یہی معمول تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ۝ (النساء: ۱۰۳)

''نماز در حقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔''

متعدد صحابۂ کرامؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نمازوں کو ہمیشہ ان کے اوقات میں ادا کرنے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:

''میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز اس کے وقت کے علاوہ (کسی دوسرے وقت) میں پڑھی ہو۔ سوائے دو نمازوں کے۔''

(صحیح بخاری، کتاب الحج، ۱۶۸۲)

لیکن عذر کی صورت میں بعض نمازیں اکٹھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ظہر و عصر کو ایک ساتھ پڑھ لیا جائے اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ۔ رسول اللہ ﷺ سے حجۃ الوداع کے دوران اسی طریقے سے مذکورہ نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا ثابت ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''نمازوں کے اوقات عام لوگوں کے لیے پانچ اور اہلِ عذر کے لیے تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ (ہود: ۱۱۴)

''نماز قائم کرو (دن) کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔''

دوسرے سرے ۔ ظہر و عصر ہے اور رات گزرنے پر مغرب و عشا۔ اسی طرح اس کا ارشاد ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ
(بنی اسرائیل:۷۸)

''نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو۔''

اس آیت میں 'دلوک' میں ظہر وعصر اور 'غسق' میں مغرب وعشاء شامل ہیں۔ اسی اصول کو اختیار کر کے رسول اللہ ﷺ نے ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی نمازوں کو جمع فرمایا تھا۔''

(فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ۲۴/ ۲۵)

احناف کے نزدیک جمع بین الصلاتین (دو نمازوں کو اکٹھی پڑھنا) جائز نہیں ہے۔ ہاں ان کو جمع کرنے کی ظاہری صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ یعنی ایک نماز اس کے آخرِ وقت میں اور دوسری نماز اس کے اولِ وقت میں پڑھی جائے۔ لیکن دیگر فقہاء اس کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک جمع تقدیم اور جمعِ تاخیر دونوں صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ یعنی دوسری نماز کو مقدم کر کے پہلی نماز کے ساتھ پڑھ لیا جائے، یا پہلی نماز کو مؤخر کر کے دوسری نماز کے ساتھ پڑھا جائے۔

عذر میں حالتِ سفر، مرض، طوفانی بارش، خوف زدہ صورتِ حال یا کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ احادیث میں ان عذروں کا ذکر آیا ہے، بل کہ حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر مدینہ میں رہتے ہوئے ظہر وعصر کی نمازیں اور مغرب وعشا کی نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ جب کہ اس وقت نہ کسی خوف کا موقع تھا، نہ بارش ہوئی تھی۔ (دوسری روایت میں ہے کہ اس وقت نہ کسی خوف کا موقع تھا نہ آپ حالتِ سفر میں تھے) حضرت ابنِ عباسؓ کے شاگرد نے ان سے دریافت کیا: پھر آں حضرت ﷺ نے ایسا کیوں کیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: ''آپؐ نے ایسا اس لیے کیا تھا، تاکہ آپ کی امت کا کوئی فرد مشقت میں نہ پڑے۔'' (صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب الجمع بین الصلاتین فی السفر)

حالتِ حضر میں کسی عذر کی بنا پر جمع بین الصلاتین کی اجازت دینے والے فقہاء (مثلاً: مالکیہ میں سے اشہبؒ، شوافع میں سے ابن المنذرؒ اور ابن سیرینؒ وابن شبرمہؒ وغیرہ) ساتھ ہی یہ بھی صراحت کرتے ہیں کہ اسے عادت نہ بنا لیا جائے، یعنی کسی شدید عذر کی بنا پر ہی جمع کیا

جائے، ورنہ ہر نماز کو اس کے وقت ہی میں ادا کیا جائے۔ (نووی، المجموع شرح المہذب، طبع جدہ، ۴/ ۲۶۴، ابن قدامہ: المغنی، طبع ریاض ۱۹۸۱ء، ۲/ ۷۸ ۲، الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت: ۱۵/ ۲۹۲)

آپ نے اپنی جو مخصوص صورت بیان کی ہے اس کا شمار عذر میں ہوسکتا ہے، لیکن کوشش کیجیے کہ وہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہے۔ اپنے افسران سے کہیے کہ وہ آپ کی علمی قابلیت اور خدمات کو دیکھتے ہوئے آپ کو پروموشن دیں، یا کوئی دوسرا کام لیں، جس میں آپ کی ایسی شدید مصروفیت باقی نہ رہے۔ ورک شاپ میں آپ سے متعلق جو کام ہے، اس کی انجام دہی کے لیے آپ کے علاوہ دوسرے افراد بھی ہوں گے۔ آخر آپ کی بیماری یا رخصت کے دنوں میں ورک شاپ میں تالا نہ لگ جاتا ہوگا اور بسیں چلنی بند نہ ہوجاتی ہوں گی۔ ان افراد سے تعاون لیجیے۔ ان کے بعض کام آپ کردیجیے تاکہ وہ آپ کے کچھ کام اپنے ذمے لے کر آپ کو نمازوں کی ادائی کے لیے مہلت دے دیا کریں۔ دین میں نماز کی اہمیت اور اس کے مقام سے آپ بہ خوبی واقف ہیں، اس لیے کوشش کیجیے کہ حتی الامکان آپ کی تمام نمازیں وقت پر ادا ہوں۔

چھوٹی ہوئی نمازوں کا کفّارہ؟

سوال: میرے ایک قریبی عزیز کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں نمازوں کے بڑے پابند تھے، مگر مرضِ وفات میں ان کی کچھ نمازیں چھوٹ گئی ہیں۔ کیا ان کا فدیہ ادا کیا جاسکتا ہے؟ اگر ہاں تو بہ راہ کرم یہ بھی بتایے کہ فدیہ کتنا ہوگا اور کیسے ادا کیا جائے گا؟

جواب: اگر کسی شخص کا انتقال ہوجائے اور اس کی کچھ نمازیں یا روزے چھوٹ گئے ہوں تو کیا اس کا وارث ان کا فدیہ ادا کرسکتا ہے؟ اس معاملے میں احادیث میں صرف روزوں کا تذکرہ ملتا ہے، نمازوں کے سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔

متاخرین فقہائے احناف نے نمازوں کو روزوں پر قیاس کرتے ہوئے چھوٹی ہوئی نمازوں پر بھی کفارہ مشروع قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی وفات سے قبل اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کیے جانے کی وصیت کردی ہو، تو اس کے ایک تہائی مال میں سے اس کی وصیت کو پورا کرنا اس کے ورثاء پر واجب ہوگا۔ لیکن اگر اس نے وصیت نہ کی ہو تو ورثاء کو

اختیار ہے۔ ان کے مطابق ایک نماز کا وہی فدیہ ہے جو ایک روزے کا ہے۔ یعنی بہ قدر صدقۂ فطر (ایک صاع جو/ نصف صاع گیہوں)۔ (اس سلسلے میں ملاحظہ کیجیے فتاویٰ دار العلوم دیوبند، طبع دیوبند ۱۳۸۴ھ، ۴/ ۳۶۳-۳۷۳، ذیلی عنوان 'بعد موت کفارۂ نماز' کے تحت مختلف فتاویٰ)

صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ فدیہ کے معاملے میں نمازوں کو روزوں پر قیاس کرنا درست نہیں۔ جس شخص کی کچھ نمازیں اس کی زندگی میں چھوٹ گئی ہوں، اس کے ورثاء کا اس کے لیے دعائے مغفرت کرنا اور اس کی طرف سے صدقہ و خیرات کرنا کافی ہے، اس کی طرف سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کرنے کا حکم نہیں ہے۔

نماز یا دینی اجتماع کے لیے مساجد میں عورتوں کی حاضری

سوال ⟨۱⟩: ہمارے شہر میں ایک کالونی بسائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔ مسجد کے اندر تقریباً سو افراد اور اس کے چبوترے پر پچاس افراد بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ کالونی کی خواتین میں الحمدللہ مذہب کے معاملے میں کافی بیداری اور دینی شعور پایا جاتا ہے۔ دو برس قبل ان کے مطالبے پر ان کے لیے بھی نماز تراویح کا نظم کیا گیا۔ اس کے لیے مسجد سے متصل ایک کمرہ تعمیر کیا گیا، جس میں تقریباً پینتیس (۳۵) خواتین کے نماز ادا کرنے کی گنجایش ہے۔ اس کمرے میں خواتین کے داخلے کا علاحدہ انتظام ہے۔ نماز تراویح کے اس نظم کی وجہ سے دوسری کالونیوں سے بھی خواتین آنے لگیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے مسجد کے مشرقی جانب صحنِ مسجد سے متصل ایک مکان میں ایک صاحب دین نے ایک بڑا کمرہ فراہم کر دیا ہے، جس میں تقریباً تیس (۳۰) خواتین نماز پڑھ سکتی ہیں۔ مسجد کے چبوترے سے اس کمرے کا فاصلہ اڑتیس (۳۸) فٹ ہے۔

مندرجہ بالا نظم پر چند حضرات نے کافی اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کا مسجد میں آنا فتنہ ہے۔ انھیں نماز کے لیے مسجد میں نہ آنے دینا چاہیے۔ ایک مقامی عالم دین نے کہا کہ مسجد کے چبوترے سے اس کمرے کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ اس بنا پر اس کمرے میں نماز ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔ گزشتہ رمضان میں موسم برسات اور خواتین کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر اس مسجد کے نصف چبوترے پر تین جانب سے قناطیں کھڑی کر کے کوشش کی گئی کہ کچھ خواتین اس پر

نماز ادا کرسکیں، لیکن اسے بھی بعض حضرات نے نکال دیا اور مسجد کے پیش امام صاحب نے مائیک سے اعلان کردیا کہ ''مسجد سے متصل مشرقی کمرے میں نماز ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔''

مسلم خواتین میں بڑھتے ہوئے دینی شعور اور بیداری کو دیکھتے ہوئے اس قسم کے مسائل دوسرے شہروں میں بھی اٹھنے کا امکان ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں ہماری رہ نمائی فرمائیں:

۱- جس موجودہ صورت میں ہماری کالونی کی مسجد سے متصل کمرے میں خواتین نماز ادا کر رہی ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں؟

۲- اگر اس کمرے کے اوپر ایک اور منزل تعمیر کرکے وہاں یا موجودہ مسجد پر ایک اور فلور تعمیر کرکے وہاں خواتین کے لیے نماز تراویح کا انتظام کردیا جائے تو ایسا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ خواتین کے لیے گراؤنڈ فلور پر اور مردوں کے لیے فرسٹ فلور پر انتظام کیا جائے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

۳- مسجد سے متصل مشرقی جانب جس کمرے میں خواتین نماز ادا کر رہی ہیں، اس میں ان کا نماز ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

۴- صفوں کے درمیان فاصلے (Gap) کا جو اعتراض اٹھایا جارہا ہے، اس کے بارے میں کیا کوئی شرعی ہدایت موجود ہے؟ بعض قدیم مساجد میں مشرق، شمال یا جنوب کی جانب ہال تعمیر کیے گئے ہیں، کنکشن دے دیے جاتے ہیں، ان مساجد میں مردوں کی آخری صف اور ہالوں میں خواتین کی پہلی صف کے درمیان کافی فاصلہ ہوتا ہے۔ اکثر پرانی مساجد میں وسط صحن میں وضو کے لیے بڑے بڑے حوض ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے بھی صفوں کے درمیان گیپ ہوجاتا ہے، مزید یہ کہ اب بہت سے حضرات تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھ کر چلے جاتے ہیں، اس وجہ سے صفوں کی تعداد کم ہوجاتی ہے اور گیپ بڑھ جاتا ہے۔ بہ راہِ کرم واضح فرمائیں کہ مردوں اور عورتوں کی صفوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ کتنا گیپ ہوسکتا ہے؟

آپ سے درخواست ہے کہ اس موضوع پر احکام شریعت کی روشنی میں ہماری رہ نمائی

فرمائیں۔

سوال ‹۲›: ادارہ فلاح الدارین کے نام سے ہم بارہ مولہ، جموں وکشمیر میں ایک ادارہ چلا رہے ہیں۔ اس کی سرگرمیوں کا ایک اہم جز مسلمان خواتین میں اسلامی بیداری لانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس حوالے سے خواتین کے بڑے بڑے اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں۔ کسی بڑے اجتماع گاہ یا کمیونٹی ہال کی عدم دستیابی کی وجہ سے خواتین کے یہ اجتماعات مساجد میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اوقاتِ نماز کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور اجتماعات ایسے اوقات میں منعقد کیے جاتے ہیں جب پنج وقتہ نمازیں ڈسٹرب نہ ہوں اور مرد نمازیوں کو کوئی دشواری اور زحمت نہ پیش آئے۔ یہاں کے بعض مقامی علماء اس پر اعتراض کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مساجد میں عورتوں کا اجتماع منعقد کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ حنفی مسلک کی رو سے عورت کا کسی بھی صورت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

جواب: مذکورہ بالا دونوں مراسلوں سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مساجد میں نمازوں یا دینی اجتماعات میں شرکت کے لیے عورتوں کی حاضری کے مسئلے پر مسلم معاشرے میں کس قدر بے چینی پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو مساجد میں عورتوں کے جانے کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں اور اس عمل کو امت کے لیے فتنہ قرار دیتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں اور اسے مسلمان خواتین کے لیے دینی اعتبار سے مفید قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلے پر جذبات سے بالاتر ہوکر سنجیدگی کے ساتھ، ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

۱- احادیث سے ثابت ہے کہ عہد نبوی میں خواتین رات میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں ان کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ مسجد نبوی کا ایک دروازہ ان کے لیے خاص کردیا گیا تھا۔ ان کی صفوں اور مردوں کی صفوں کے درمیان فاصلہ رکھا جاتا تھا اور درمیان میں بچوں کی صفیں ہوتی تھیں۔ نماز کے بعد موقع دیا جاتا تھا کہ عورتیں پہلے نکل جائیں۔ مرد کچھ دیر کے بعد نکلتے تھے۔ عورتوں کو تاکید تھی کہ وہ خوش بو لگا کر یا زیب وزینت اختیار کرکے مسجد میں نہ جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی بعض لوگ عورتوں کا مسجد جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں تاکید کی کہ اپنی پسند و ناپسند کو

معیار بنا کر عورتوں کو مسجد جانے سے نہ روکیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاَ تَمنَعُوا اِمَاءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہِ۔ (سنن ابی داؤد: ۵۶۵)

''اللہ کی باندیوں (خواتین) کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو۔''

یہ حدیث احمد، عبدالرزاق، دارمی، ابن خزیمہ اور بیہقی نے بھی روایت کی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا استَاذَنَکُم نِسَاءُ کُم بِاللَّیلِ اِلَی المَسَاجِدِ فَاذَنُوا لَھُنَّ۔

(بخاری: ۸۶۵، مسلم: ۴۴۲)

''اگر تمھاری عورتیں رات کو مساجد میں جانے کے لیے تم سے اجازت مانگیں تو انھیں اجازت دے دو۔''

دوسری طرف بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے عورتوں کے لیے اپنے گھروں میں فرض نمازوں کی ادائی کو بہتر قرار دیا ہے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَیرُ مَسَاجِدِ النِّسَآءِ قَعرُ بُیُوتِھِنَّ۔

(احمد: ۶/ ۲۹۷، ابن خزیمہ: ۱۶۸۳، حاکم: ۱/ ۲۰۹، بیہقی: ۳/ ۱۳۱)

''عورتوں کے لیے نماز ادا کرنے کی بہترین جگہ ان کے گھروں کا اندرونی حصہ ہے۔''

بل کہ بعض احادیث میں آپؐ نے دونوں باتیں ایک ساتھ فرمائی ہیں۔ ایک طرف آپؐ نے مردوں کو روکا کہ عورتوں پر اپنی مرضی نہ تھوپیں، دوسری طرف عورتوں سے فرمایا کہ ان کا گھروں ہی میں نماز پڑھ لینا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لاَ تَمنَعُوا نِسَآءَ کُمُ المَسَاجِدَ وَ بُیُوتُھُنَّ خَیرٌ لَّھُنَّ۔

(ابوداؤد: ۵۶۷، ابن خزیمہ: ۱۶۸۴، احمد: ۲/ ۷۲)

''اپنی عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے نہ روکو، لیکن ان کے گھر ہی ان کے لیے بہتر ہیں۔''

کتب حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی زوجہ برابر مسجد میں فجر اور عشاء کی نمازیں باجماعت ادا کرنے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ کسی نے ان سے کہا: عمرؓ عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے ہیں، پھر آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: جب تک وہ مجھے صراحت سے منع نہیں کریں گے، میں جاتی رہوں گی۔ اس شخص نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ نے منع کرنے سے روکا ہے۔ پھر وہ کیوں منع کریں گے۔ (بخاری: ۹۰۰)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عورتیں اگر چاہیں تو باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جاسکتی ہیں۔ اسی طرح وہ نماز تراویح میں بھی شریک ہوسکتی ہیں۔

۲- عورتیں اگر مساجد میں جا کر نماز باجماعت میں شریک ہونے کی خواہش مند ہیں تو ان کے لیے خصوصی انتظامات کیے جانے چاہئیں۔ مسجد کے شمال یا جنوب کے حصے میں دیوار کھڑی کر کے یا کوئی Partition کر کے یا موٹا پردہ لٹکا کر یا مسجد سے متصل کوئی کمرہ تعمیر کر کے اس حصے کو اس کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔ مسجد کے مشرقی جانب اس سے متصل کسی کمرے میں بھی وہ نماز ادا کرسکتی ہیں۔ بہ شرطے کہ ایسا انتظام ہو کہ انھیں امام کی نقل و حرکت کا صحیح طریقے سے علم ہوتا رہے۔ بلا ضرورت صفوں کے درمیان فاصلہ رکھنا پسندیدہ نہیں ہے۔ البتہ بہ وقتِ ضرورت اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔

۳- مردوں اور عورتوں کی صفوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ کتنا فاصلہ ہوسکتا ہے؟ اس بارے میں کوئی صریح نص نہیں ہے۔ فقہاء نے بعض وضاحتیں کی ہیں۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ اقتداء درست ہونے کے لیے مقتدیوں کو امام کی نقل و حرکت صحیح طور پر معلوم ہوتی رہے اور وہ کسی شک و شبہ میں نہ پڑیں۔ اس معاملے میں بعض فقہاء نے مسجد اور غیر مسجد میں فرق کیا ہے۔ ان کے نزدیک میدان میں نماز پڑھنے کی صورت میں اگر کہیں دو صفوں سے زیادہ کا فاصلہ ہے تو پیچھے کے مقتدیوں کی نماز درست نہ ہوگی۔ (نماز عیدین اس سے مستثنیٰ ہے) مسجد میں اگر پیچھے نماز پڑھنے والے امام یا آگے کے مقتدیوں کو دیکھ رہے ہوں یا تکبیر سن رہے ہوں تو ان کی نماز صحیح ہوگی خواہ درمیان میں کتنا ہی فاصلہ ہو۔ (الموسوعة الفقيهة كويت ۶ / ۲۳، بہ حوالہ الفتاوی الہندیہ ۱ / ۸۸، مغنی المحتاج، ۱ / ۲۴۸)

۴- مسجد اگر دو منزلہ ہے تو اس کا گراؤنڈ فلور عورتوں کے لیے خاص کر دینا اور مردوں کے لیے فرسٹ فلور پر انتظام کرنا صحیح نہیں۔ مسجد کا اصل حصہ گراؤنڈ فلور کا ہے۔ اس میں مردوں کی جماعت ہونی چاہیے۔ عورتوں کے لیے فرسٹ فلور یا اگر کسی مسجد میں تہہ خانہ ہو تو اسے خاص کیا جا سکتا ہے۔

۵- عورتوں کے لیے مخصوص دینی اجتماعات منعقد کیے جا سکتے ہیں۔ عہد نبوی میں اس کی نظیر ملتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! زیادہ تر صرف مرد ہی آپ کی باتیں سنتے ہیں۔ اس لیے آپؐ ہم عورتوں کے لیے ایک دن خاص کر دیجیے۔ جس میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کر سکیں۔ آپؐ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ان کے لیے ایک دن خاص کر دیا۔ عورتیں اس دن اکٹھا ہوئیں اور آپؐ نے ان کے پاس جا کر انھیں وعظ و تلقین کی۔ (بخاری: ۱۰۱، ۱۲۴۹، ۷۳۱۰)

۶- خواتین کے یہ اجتماعات دیگر مناسب مقامات مثلاً لیکچر ہال، کمیونٹی سنٹر وغیرہ میں منعقد کیے جا سکتے ہیں اور مساجد میں بھی ان کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ مذکور بالا حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ عورتوں کا مخصوص اجتماع کہاں ہوا تھا؟ حدیث میں فی مکان کذا و کذا (فلاں مقام پر) کے الفاظ ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہ جگہ مسجد کے علاوہ کوئی اور تھی۔ لیکن دینی باتیں سننے کے لیے عورتوں کے مسجد جانے کی ممانعت کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: لوگو! عورتوں کے مہر بہت زیادہ نہ رکھو۔ اگر یہ کوئی خوبی کی بات ہوتی تو نبی ﷺ ایسا ضرور کرتے، حالاں کہ آپؐ نے اپنی کسی بیوی یا بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں رکھا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس سے زیادہ مہر رکھے گا تو یہ زائد رقم میں اس سے زبردستی لے کر بیت المال میں جمع کرا دوں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ سن کر عورتوں کی صف سے ایک طویل القامت عورت اٹھی اور اس نے سورۂ نساء کی آیت ۲۰ کا حوالہ دے کر کہا:

''اے امیر المومنین! جب اللہ تعالیٰ نے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی بات سے رجوع فرمالیا۔

(تفسیر ابن کثیر، ۱/ ۵۲۲، ۵۲۳)

یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ اور احمد نے بھی نقل کی ہے۔

۷- یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ عورتوں کا کسی بھی صورت میں مسجد میں داخلہ جائز نہیں ہے۔ احادیث سے ثابت یہ ہے کہ عہد نبوی میں عورتیں نہ صرف نماز باجماعت کی ادائی کے لیے، بل کہ دوسرے کاموں کے لیے بھی مسجد جایا کرتی تھیں۔ عہد نبوی میں ایک عورت کا کوئی گھر بار نہ تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا تو اس کے لیے عارضی انتظام کے تحت مسجد نبوی میں خیمہ لگا دیا گیا تھا (فَكَانَتْ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ) امام بخاری (۴۳۹) نے اس روایت پر یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: باب نوم المرأة في المسجد (اس چیز کا بیان کہ عورت مسجد میں سو سکتی ہے) ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت مسجد میں جھاڑو لگایا کرتی تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے آں حضرت ﷺ کو اطلاع دیے بغیر اس کی تدفین کر دی۔ بعد میں آپ کو پتا چلا تو آپؐ اس کی قبر پر تشریف لے گئے (بخاری: ۴۵۸-۴۶۰) رفیدہ نامی ایک خاتون کو علاج معالجہ کی خاصی معلومات تھیں۔ غزوۂ احزاب کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوا دیا تھا اور حضرت سعد بن معاذؓ کے علاج کی انھیں ذمے داری سونپی تھی۔ (سیرۃ ابن ہشام، ۷ ۱۹۳ء، ۳/ ۲۵۸) غزوۂ احزاب کے بعد ایک دوسری خاتون حضرت کعیبۃ بنت سعدؓ کا بھی خیمہ مسجد نبوی میں نصب کیا گیا تھا اور انھیں زخمیوں کے علاج کی ذمے داری دی گئی تھی۔ (طبقات ابن سعد، ۶/ ۲۱۲)

البتہ یہ ملحوظ رہے کہ عورتوں کی مسجد میں حاضری پاکی کی حالت میں ہونی چاہیے اور یہ عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ مردوں کے لیے بھی ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔

۸- گزشتہ سطور میں یہ بات آچکی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک طرف عورتوں کو مسجد جانے سے روکنے سے منع کیا ہے، دوسری طرف عورتوں کے لیے گھر ہی میں نماز پڑھنے کو بہتر قرار دیا ہے۔ اس بنا پر احناف نے نماز باجماعت کے لیے مسجد جانا

عورتوں کے لیے مکروہ کہا ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالم گیری میں ہے:
''عورتوں کے لیے نماز باجماعت میں حاضری مکروہ ہے۔ ہاں بوڑھی عورت کے لیے فجر، مغرب اور عشاء میں اجازت ہے۔ آج کے دور میں فتویٰ یہ ہے کہ کراہت تمام نمازوں کے لیے ہے، اس لیے کہ فساد عام ہوگیا ہے۔ الکافی میں یہی مذکور ہے۔ یہی قول مختار ہے، جیسا کہ التبیین میں بیان کیا گیا ہے۔ (فتاویٰ عالم گیری، طبع دیوبند، ۱/۸۹)
مذکورہ فتویٰ میں جس فساد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کی بنیاد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اس قول میں موجود ہے۔ وہ اپنے زمانے کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کی وہ صورت حال دیکھ لیتے جو ہم نے دیکھی ہے تو آپ انھیں اسی طرح مسجد جانے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل نے اپنی عورتوں کو روک دیا تھا۔'' (بخاری:۸۶۹، مسلم:۴۴۵)

۹- اس مسئلے میں غور اور فیصلہ کرتے وقت روح شریعت کو ضرور اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دین کا مزاج اجنبی مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط کو ناپسند کرتا ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کے لیے پردے کے حدود متعین کرتا ہے۔ جن مساجد میں عورتوں کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے ہوں ہوں اور اختلاط کے مواقع مسدود کردیے گئے ہوں، ان میں وہ پردہ اور دیگر شرعی حدود و قیود کے ساتھ نماز باجماعت کی ادائی کے لیے جاسکتی ہیں۔ لیکن جن مساجد میں ایسا کوئی انتظام نہ ہو، ان میں انھیں جانے سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے۔ اسی طرح پردہ اور عدم اختلاط کے بنیادی اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے مساجد میں عورتوں کے مخصوص اجتماعات کے انعقاد میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نمازِ وتر کا وقت

ایک صاحب لکھتے ہیں:

''ماہ نامہ زندگی نو ستمبر ۲۰۰۹ء کے 'فقہی استفسارات' کے کالم کے تحت نماز وتر کے سلسلے میں استفسار کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ ''نماز وتر عشاء کی نماز کے ساتھ مشروع ہے۔'' جب کہ

حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کبھی بھی نمازِ وتر عشاء کی نماز سے متصل ادا نہیں فرمائی، بل کہ ہمیشہ شب کی آخری نماز کے طور پر ادا کی ہے۔ جب آپؐ کے عمل اور احادیث سے ثابت ہے کہ نماز وتر رات کی آخری نماز ہے تو یہ عشاء کی نماز کے ساتھ مشروع کیسے ہوئی؟ میرے خیال میں موجودہ چلن کو دھیان میں رکھتے ہوئے نماز وتر کو بغیر تحقیق کے عشاء کی نماز کے ساتھ مشروع قرار دے دیا گیا ہے۔ نماز وتر کے سلسلے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ وہ عشاء کی نماز کے ساتھ مشروع ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وتر کی نماز دراصل تہجد کی نماز ہے اور وہ بھی آخری۔ وہ روایات جن میں اس نماز کی فضیلت کے طور پر یہ بتایا گیا کہ جس کو رات کے آخر پہر تہجد کے لیے بیدار نہ ہونے کا اندیشہ ہو، وہ یہ نماز پڑھ کر سوئے، دراصل اس لیے ہے کہ جو شخص اس وقت بیدار نہ ہو پائے یا نہ ہونا چاہتا ہو، وہ تہجد کی نماز کا مختصر سا حصہ وتر کی شکل میں ادا کر لے، گویا تہجد کی نماز سے بالکلیہ کوئی شخص محروم نہ رہ جائے۔ ورنہ وتر کی نماز اصلاً تہجد کی نماز ہے۔''

جواب: اس مراسلہ میں صاحبِ مراسلہ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صحیح نہیں ہیں۔ احادیث سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جارہی ہے:

۱۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ''وتر کی نماز دراصل تہجد کی نماز ہے۔'' یہ بالکل غلط ہے۔ حدیث یا فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لی جائے، دونوں نمازوں کا بیان الگ الگ ملتا ہے۔ تہجد کی اصطلاح قرآن کی آیت: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ (بنی اسرائیل:۷۹) سے اخذ کی گئی ہے۔ احادیث میں اس کے لیے صلاۃ اللیل (رات کی نماز) کے الفاظ آئے ہیں۔ نمازِ وتر کا تذکرہ احادیث میں اس سے الگ اور مستقل آیا ہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو: حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ قیامِ لیل کرتے تھے، میں سوئی ہوئی ہوتی تھی، پھر جب آپ وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے بیدار کرتے تھے اور میں بھی وتر پڑھتی تھی'' (بخاری: ۵۱۹، مسلم: ۷۴۴) اسی بنا پر جملہ محدثین نے صلاۃ اللیل اور صلاۃ الوتر کا تذکرہ الگ الگ کیا ہے۔

۲۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''احادیث سے ثابت ہے کہ نمازِ وتر رات کی آخری نماز ہے۔'' اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نمازِ وتر کی مشروعیت آخرِ شب میں ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ نمازِ وتر کا وہی وقت ہے، جو نمازِ عشاء کا ہے۔ اسے عشاء کی نماز کے بعد

سے طلوعِ فجر تک کسی بھی وقت پڑھا جاسکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرکے فرمایا:

ان اللّٰہ قد امدکم بصلاۃ الوتر، جعلہ اللّٰہ لکم فیما بین صلاۃ العشاء الی ان یطلع الفجر۔ (ابن ماجہ:۱۱۶۸، صححہ الالبانی)

''اللہ نے تمھیں نمازِ وتر عطا کی ہے اور اس کا وقت نمازِ عشاء کے بعد سے طلوعِ فجر تک رکھا ہے۔''

۳- وہ لکھتے ہیں: '' آپؐ نے اپنی زندگی میں کبھی بھی نمازِ وتر عشاء کی نماز سے متصل ادا نہیں فرمائی، بل کہ ہمیشہ شب کی آخری نماز کے طور پر ادا کی ہے۔'' یہ بات حدیث سے بے خبری پر مبنی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے ان کے شاگرد مسروق نے دریافت کیا: رسول اللہ ﷺ وتر کی نماز کب پڑھا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: آپؐ نے اسے رات کے ابتدائی حصے میں بھی پڑھا ہے، درمیانی حصے میں بھی اور آخری حصے میں بھی۔ البتہ زندگی کے آخری ایام میں آپ اسے سحر سے قبل پڑھا کرتے تھے۔'' یہ حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے بخاری:۹۹۶، مسلم: ۷۴۵، ابوداؤد: ۱۴۳۵، ترمذی: ۴۵۶ نسائی: ۱۶۸۱، ابن ماجہ: ۱۱۸۵۔ اسی کی گواہی حضرت علیؓ نے بھی دی ہے (ابن ماجہ: ۱۱۸۶) ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ایک دوسرے شاگرد عبد اللہ بن قیس نے ان سے رسول اللہ ﷺ کی نمازِ وتر کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: آپؐ وتر کبھی رات کے ابتدائی حصے میں پڑھا کرتے تھے اور کبھی رات کے آخری حصے میں۔ (ابوداؤد: ۱۴۳۷)

۴- حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وتراً۔ (بخاری:۹۹۸، مسلم:۷۵۱)

''اپنی رات کی نمازوں میں سب سے آخر میں وتر پڑھو۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو اس حدیث کے الفاظ پر غور نہ کرنے کی وجہ سے غلط فہمی

ہوگئی ہے۔ حدیث میں 'آخر اللیل' کے الفاظ نہیں، بل کہ 'آخر الصلاۃ' کے الفاظ ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ رات کے آخری حصے میں وتر پڑھو، بل کہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ رات کی نمازوں میں سب سے آخر میں وتر پڑھو۔ اب اگر کوئی شخص نمازِ تہجد کا اہتمام کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے وتر کی نماز تہجد کے بعد ہی پڑھنی چاہیے، اس لیے کہ اس کی رات کی سب سے آخری نماز تہجد کی ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو تہجد کی توفیق نہیں ہو پاتی۔ وہ نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد طلوع فجر تک کوئی نماز نہیں پڑھتا تو اسے حکمِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے عشاء کی فرض، سنن اور نوافل کے بعد آخر میں وتر کی نماز پڑھ لینی چاہیے۔

ماہِ رمضان میں نمازِ وتر کی انفرادی ادائی

سوال: ایک شخص مستقل تہجد گزار ہے۔ لہٰذا وتر وہ تہجد ہی میں ادا کرتا ہے۔ رمضان میں نماز وتر تراویح کے بعد جماعت سے ادا کی جاتی ہے۔ بہ راہِ کرم وضاحت فرمائیں، کیا تراویح کے بعد وتر جماعت سے پڑھنا افضل ہے یا تہجد کے وقت نمازِ تہجد کے بعد تنہا اس کی ادائی افضل ہے؟

جواب: نمازِ وتر عشاء کی نماز کے ساتھ مشروع ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص رات میں اٹھ کر نوافل پڑھتا ہے تو اسے وتر نوافل کی ادائی کے بعد پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وترا۔ (بخاری:۹۹۸، مسلم:۷۵۱)

''اپنی رات کی نمازوں میں سب سے آخر میں وتر پڑھا کرو۔''

جو شخص مستقل تہجد گزار ہے اسے نماز وتر آخر شب تہجد کی نماز کے بعد ادا کرنی چاہیے۔ حدیث میں اس کو افضل کہا گیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من خاف ان لا یقوم من آخر اللیل فلیوتر اولہ، و من طمع ان یقوم آخرہ فلیوتر آخر اللیل فان صلاۃ آخر اللیل مشھودۃ و ذلك افضل۔ (مسلم:۷۵۵)

''جس شخص کو اندیشہ ہو کہ وہ آخر شب اٹھ نہیں سکے گا، اسے وتر پہلے ہی پڑھ لینی چاہیے، لیکن جسے آخر شب اٹھنے کی امید ہو اسے آخر شب میں وتر پڑھنی چاہیے۔ وہ وقت فرشتوں کی موجودگی کا ہوتا ہے اور وہ افضل وقت ہے۔''

ایک روایت میں ہے کہ ایک مجلس میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا کہ وہ کس وقت وتر پڑھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: عشا کی نماز کے بعد رات کے ابتدائی حصے میں۔ پھر آپؐ نے یہی سوال حضرت عمرؓ سے کیا تو انھوں نے جواب دیا: رات کے آخری حصے میں۔ تب آپؐ نے فرمایا: اے ابوبکر! تم نے احتیاط ملحوظ رکھی اور اے عمر! تم نے عزیمت پر عمل کیا۔ (احمد، ابوداؤد، حاکم)

ماہِ رمضان میں نمازِ تراویح کے بعد وتر کی نماز بھی باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کا ماہِ رمضان میں بھی تہجد کا معمول ہو تو افضل یہ ہے کہ وہ تہجد کے بعد گھر پر انفرادی طور پر وتر ادا کرے۔ لیکن اگر اس کا معمول نہ ہو اور اندیشہ ہو کہ شاید وہ نہ اٹھ سکے یا اٹھے تو سحری کا وقت تنگ ہو تو ایسی صورت میں نمازِ تراویح کے بعد باجماعت وتر ادا کر لینی چاہیے۔

فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

الوتر في رمضان بالجماعة أفضل من أدائها في منزله و هو الصحيح هكذا في السراج الوهاج. و قال بعضهم الأفضل أن يوتر في منزله منفرداً و هو المختار هكذا في التبيين۔ (طبع دار الکتاب دیوبند، ۱/۱۱۶)

''رمضان میں وتر جماعت کے ساتھ ادا کرنا اسے گھر میں ادا کرنے سے افضل ہے۔ یہی صحیح ہے، جیسا کہ السراج الوہاج میں ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ وتر گھر میں تنہا ادا کرنا افضل ہے۔ یہی قول مختار ہے، جیسا کہ التبیین میں ہے۔''

بیماری کی بنا پر روزہ رکھنے سے معذوری

سوال: میں شوگر کا کئی سال سے مریض ہوں، جس کی وجہ سے اس کے عوارض کا شکار رہتا ہوں۔

وقتاً فوقتاً بلڈ شوگر کا ٹیسٹ کراتا رہتا ہوں۔ آج کل فاسٹنگ تقریباً ۲۰۰ ہے، جب کہ نارمل ۱۱۰ تک رہنی چاہیے۔ ڈاکٹر اس مرض میں زیادہ دیر تک بھوکا رہنے سے منع کرتے ہیں۔ اس لیے کہ بھوک کی حالت میں شوگر لیول (Sugar Level) عموماً گر جاتا ہے، اور اگر وہ نارمل سے بھی نیچے چلا جائے تو شوگر لیول بڑھنے کے مقابلے میں یہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر ایسے مریض کو ہدایت کرتے ہیں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ نہ کچھ کھاتا رہے۔ پیاس بھی اس مرض میں زیادہ لگتی ہے۔ امسال روزے کا دورانیہ تقریباً ساڑھے چودہ گھنٹے کا ہوگا۔ مجھ جیسے شوگر کے مریض کا اتنے لمبے عرصے تک بھوکا پیاسا رہنا صحت کے لیے ضرر رساں ہو سکتا ہے۔ کیا میرے لیے گنجایش ہے کہ میں اس وقت روزہ نہ رکھوں اور بعد میں ان دنوں میں جب دن نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں، ان کی قضا کرلوں؟ بہ راہ کرم شریعت کی روشنی میں میری رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: رمضان کے روزوں کی فرضیت قرآن مجید سے ثابت ہے (البقرۃ: ۱۸۳) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جو شخص بھی ماہِ رمضان پائے وہ اس میں روزہ رکھے (البقرۃ: ۱۸۵) اس کا شمار اسلام کے بنیادی ارکان میں ہوتا ہے (بخاری: ۸، مسلم: ۱۶) روزۂ رمضان کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل حدیث سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ارشاد فرمایا:

مَنْ اَفْطَرَ يَوْمًا مِنْ رَمَضَانَ فِي غَيْرِ رُخْصَةٍ رَخَّصَهَا اللّٰهُ لَهٗ لَمْ يَقْضِ عَنْهُ صِيَامَ الدَّهْرِ كُلِّهٖ وَ اِنْ صَامَهٗ۔

(ترمذی: ۷۲۳، ابوداود: ۲۳۹۶، ابن ماجہ: ۱۶۷۲)

”جس شخص نے بغیر کسی عذر کے رمضان میں ایک دن روزہ نہ رکھا وہ اگر زندگی بھر روزہ رکھے تو اس کی قضا نہیں ہو سکتی۔“

علامہ البانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے اس کو اپنی صحیح میں کتاب الصوم، باب اذا جامع فی رمضان کے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے۔ اس میں في غير رخصة کی جگہ من غیر عذر و لا مرض کے الفاظ ہیں۔

لیکن اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے انسانی کم زوریوں اور معذوریوں کی بھرپور رعایت کی ہے۔ چناں چہ روزے کو فرض قرار دینے کے معاً بعد یہ صراحت کردی گئی ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

(البقرۃ:۱۸۴)

''اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی مقدار پوری کرلے۔''

اگلی آیت میں پھر اسی ٹکڑے کی تکرار ہے۔ وہاں ساتھ ہی یہ صراحت بھی کردی گئی ہے کہ اس رخصت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا مقصود بندوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ز (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔''

مریض کی تین حالتیں ہیں:

اول: اس کے لیے روزہ رکھنا ممکن نہ ہو۔ ایسے شخص کے لیے روزہ نہ رکھنا واجب ہے۔

دوم: وہ روزہ رکھ سکتا ہو، لیکن اس صورت میں اس کے مشقت میں پڑنے اور ضرر لاحق ہونے کا ظنِ غالب ہو۔ ایسے شخص کے لیے روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔

سوم: اس کا مرض ایسا ہو کہ اس کے ساتھ روزہ رکھنے کی صورت میں اس کے مشقت میں پڑنے اور ضرر لاحق ہونے کا ظنِ غالب نہ ہو۔

بعض اصحابِ علم کہتے ہیں کہ آخر الذکر حالت کے مریض کو بھی اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔ یہ رائے رکھنے والوں میں محمد بن سیرینؒ، عطاءؒ اور امام بخاریؒ کے نام مذکور ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکمِ روزہ سے استثنا میں مطلق مرض کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے عرفِ عام میں جس کو بھی مریض کہا جاتا ہے اسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ خواہ اس کا مرض جس نوعیت کا بھی ہو۔ لیکن جمہور علماء صرف ایسے مریض کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیتے ہیں جو کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ روزہ رکھنے کی صورت میں تکلیف میں مبتلا ہوجانے، اس کے مرض میں اضافہ ہونے یا اس سے شفایابی میں تاخیر ہوجانے کا ظنِ غالب ہو۔

(احکام القرآن، ابن العربی مالکی، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۳۱ھ، ۱/ ۳۳، الجامع لاحکام القرآن، ابو عبد اللہ القرطبی، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۸۷ء، ۲/ ۲۷۶)

علامہ ابوبکر جصاص رازی حنفیؒ نے مختلف فقہاء کے اقوال نقل کیے ہیں کہ روزہ نہ رکھنے کی اسی صورت میں اجازت ہے جب ضرر لاحق ہونے اور مرض بڑھنے کا اندیشہ ہو۔ دلیل میں انھوں نے ایک صحابی حضرت انس بن مالک کعبی قشیریؓ سے مروی ایک حدیث پیش کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ نے مسافر کو نماز میں قصر کرنے اور روزہ نہ رکھنے اور حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے۔'' (ابوداود: ۲۴۰۸، ترمذی: ۷۱۵، ابن ماجہ: ۱۶۶۷، البانیؒ نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے) اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ حاملہ اور مرضعہ کو یہ رخصت اس وجہ سے دی گئی ہے کہ روزہ کی صورت میں انھیں اور ان کے بچے کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے جو لوگ ان کے حکم میں ہوں ان کے لیے روزہ نہ رکھنے کا جواز اندیشۂ ضرر سے متعلق ہوگا۔ (احکام القرآن، جصاص، المطبعۃ البہیۃ مصر، ۱۳۴۷ھ، ۱/ ۲۰۴)

رہا یہ سوال کہ چھوٹے ہوئے روزوں کے بدلے کیا کیا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امراض کی دو صورتیں ہیں۔ بعض امراض وقتی اور عارضی ہوتے ہیں، علاج کے بعد ان کے زائل ہوجانے کی امید ہوتی ہے، جب کہ بعض امراض کا زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ ایسے مریض جنھیں اپنے مرض سے افاقہ پانے کی امید ہو انھیں قرآن نے دوسرے دنوں میں ان کی قضا کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن جن امراض کے زندگی بھر دور ہونے کی امید نہ ہو ان میں مبتلا مریضوں کو فدیہ ادا کرنا چاہیے۔ ایک روزہ کا فدیہ صدقۂ فطر کے برابر ہے۔

موسم گرما میں روزہ کا دورانیہ کم از کم بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ شوگر کے جو مریض اتنا عرصہ بھوک برداشت نہیں کر سکتے، انھیں روزہ نہ رکھ کر بعد میں اس کی قضا کرنے کا ارادہ کرنے کے بہ جائے فدیہ ادا کرنا چاہیے۔

روزوں کی قضا کا مسئلہ

سوال: بہ راہ کرم میرے درج ذیل سوالات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں:

(۱) ولادت کے بعد ایامِ نفاس میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میرے کئی بچوں کی ولادت ماہ رمضان میں ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے کافی روزے قضا ہوگئے ہیں اور ان

پر عرصہ بیت گیا ہے۔ درمیان میں جب جب ہمت ہوئی ان میں سے کچھ روزے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صحت وتن درستی کے لحاظ سے کم زور و ناتواں واقع ہوئی ہوں۔ گھریلو ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔ جب جب روزہ رکھنے کی کوشش کرتی ہوں، نڈھال ہوجاتی ہوں۔ صحت اس میں تسلسل کی اجازت نہیں دیتی۔ مختلف عوارض کا علاج بھی جاری ہے۔ کیا ان حالات میں روزہ رکھ کر ہی قضا روزوں کا فرض ساقط ہوگا یا فدیہ دے کر بھی اس فرض سے سبک دوش ہوا جاسکتا ہے؟

(۲) اگر حج کا ارادہ ہو اور بہت سے روزوں کی قضا بھی لازم ہو تو کیا سفر سے پہلے قضا روزوں کی ادائی ضروری ہے؟

(۳) فدیہ کے سلسلے میں بھی وضاحت فرمائیں کہ اس کا صحیح طریقہ اور مقدار کیا ہے؟

جواب:〈ا〉 رمضان کے روزے اسلام کے ارکان میں سے ہیں۔ ان کا وجوب کتاب وسنت کے ثابت ہے۔ ان کی فرضیت کا انکار کفر ہے اور بغیر کسی عذر کے ان کا ترک آدمی کے دین وایمان کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے بغیر کسی رخصت (عذر) کے رمضان کا ایک روزہ نہیں رکھا وہ اگر زندگی بھر روزہ رکھے تو بھی اس چھوٹے ہوئے روزے کی تلافی نہیں ہوسکتی۔“

(ابوداؤد: ۲۳۹۶، ترمذی: ۷۲۳، ابن ماجہ: ۱۶۷۲)

لیکن جو لوگ کسی عذر کی بنا پر روزہ نہیں رکھ سکتے ان کے لیے رخصت ہے۔ اصحابِ اعذار کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ بعض لوگوں پر دوسرے دنوں میں ان کی قضا لازم ہے اور بعض کے لیے صرف فدیہ کفایت کرتا ہے، قضا ضروری نہیں۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ جن لوگوں سے اس بات کی امید ہو کہ وہ بعد میں، چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرنے کی پوزیشن میں آسکتے ہیں ان پر قضا لازم ہے، لیکن جن کے بارے میں اس کی امید نہ ہو وہ فدیہ ادا کرسکتے ہیں۔

چناں چہ بوڑھے مرد و عورت (جو روزہ رکھنے پر قادر نہ ہوں) اور وہ مریض جس کی شفا یابی کی امید نہ ہو، انھیں روزہ نہ رکھ کر اس کا فدیہ ادا کرنے کی اجازت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ آیت وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ (البقرة: ۱۸۴) کی تفسیر میں فرماتے

ہیں: یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے ہے، کہ اگر وہ روزہ نہ رکھ سکیں تو ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔''

(تفسیر ابن کثیر، مؤسسۃ الریان بیروت، ۲۰۰۷ء، ۱/ ۲۴۸)

رہا وہ مریض جس کی شفایابی کی امید ہو اور مسافر تو انھیں چھوٹے ہوئے روزوں کا فدیہ ادا کرنے کی اجازت نہیں، ان پر ان روزوں کی دوسرے دنوں میں قضا کرنی لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

(البقرۃ: ۱۸۵)

''اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔''

حیض، حمل، نفاس (بعد ولادت کے چند ایام) اور رضاعت (دودھ پلانا) کو فقہاء نے مرض کی حیثیت دی ہے اور انھیں مرض کی اس شق میں شمار کیا ہے جس میں شفایابی کی امید رہتی ہے، چناں چہ ان صورتوں میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا لازم ہے۔ احادیث میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت انس بن مالک الکعبیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللّٰہ تعالٰی وضع عن المسافر الصوم و شطر الصلاۃ و عن الحامل او المرضع الصوم۔ (ترمذی: ۷۱۵، نسائی: ۲۲۷۹)

''اللہ نے مسافر سے روزہ اور نصف نماز ساقط کر دی ہے اور حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) سے روزہ ساقط کر دیا ہے۔''

'روزہ ساقط کرنے' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ان کو ادا ہی نہیں کرنا ہے، بل کہ جس طرح مسافر پر قضا لازم ہے، اسی طرح حاملہ و مرضعہ کو بھی قضا کرنا ہوگا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ عہدِ رسالت میں جب ہم حیض سے ہوتے تھے تو ہمیں روزہ نہ رکھنے اور بعد میں ان کی قضا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ اس دوران جو نمازیں ہم سے چھوٹتی تھیں ان کی قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ (ابوداؤد: ۲۶۳، ترمذی: ۷۸۷)

اگر کسی شخص پر کچھ روزوں کی قضا لازم ہو، مگر اس نے سستی میں قضا روزے نہ رکھے ہوں اور عرصہ بیت گیا ہو، اب اس کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہوں، روزہ رکھنے کی اس میں سکت نہ ہو، یا روزہ رکھنے کی صورت میں وہ بہت زیادہ نڈھال ہو جاتا ہو، تو وہ شیخ فانی (بوڑھا مرد) عجوز (بوڑھی عورت) اور ناقابل شفاء مریض کے حکم میں ہے۔ وہ موجودہ روزوں کے بدلے بھی فدیہ ادا کرے گا اور سابق میں چھوٹے ہوئے روزوں کا بھی فدیہ دے گا۔ لیکن یہ صورت درست نہیں معلوم ہوتی کہ وہ حالیہ رمضان کے روزے تو رکھے، لیکن پہلے چھوٹے ہوئے روزوں کا فدیہ ادا کردے۔ اگر وہ حالیہ رمضان کے روزے رکھ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سابقہ متروکہ روزوں کی بھی قضا کرسکتا ہے۔ ہر شخص اپنے رب کی بارگاہ میں جواب دہ ہے۔ وہ اپنی صحت اور توانائی کا خود اندازہ لگائے اور اپنے بارے میں خود فیصلہ کرے کہ کیا واقعی اب اس میں روزہ رکھنے کی سکت نہیں رہی، یا وہ لازم قضا روزوں کا بار اپنے اوپر سے اتارنے کے حیلے بہانے تلاش کر رہا ہے۔

(۲) کوئی شخص سفرِ حج کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کے ذمّے کچھ روزوں کی قضا ہو تو سفر سے پہلے قضا روزوں کی ادائی ضروری نہیں۔ وہ واپس آکر بھی انھیں ادا کرسکتا ہے۔

(۳) روزہ کے فدیہ کی مقدار کیا ہے؟ اس سلسلے میں احادیث میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ فقہاء نے اسے صدقۂ فطر پر قیاس کیا ہے۔ (احناف کے نزدیک صدقۂ فطر کی مقدار گیہوں کا نصف صاع ہے، جو ایک کلو پانچ سو نوے گرام کے مساوی ہے) اگر فدیہ مسکین کو کھانا کھلانے کی صورت میں ادا کرنا ہے تو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلانا ہے۔ (ملاحظہ کیجیے فتاویٰ دار العلوم دیوبند، طبع دیوبند، ۱۹۷۲ء، ۶/۴۴۸ قاموس الفقہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند: ۲۰۰۷ء، ۴/۴۵۰)

رمضان میں امام مسجد کو بونس

سوال: ہمارے یہاں ایک مسجد ہے، جس کے امام کو ہر ماہ پانچ ہزار روپے تنخواہ دی جاتی ہے۔ تراویح پڑھانے کے لیے الگ سے ہنگامی چندہ کیا جاتا تھا اور اسے نذرانے کے طور پر امام

صاحب کو دیا جاتا تھا۔ مگر بعض رسائل میں اس کے خلاف مستند اداروں کا فتویٰ شائع ہوا اور ہماری مسجد کے متولی صاحب نے بھی الگ سے فتویٰ منگوایا، جس میں اسے ناجائز کہا گیا تھا، تو اسے بند کردیا گیا۔ مگر پھر بونس کے نام سے دو ماہ کے برابر تنخواہ یعنی دس ہزار روپے عید کے موقع پر دیے جانے لگے۔ دلیل یہ دی گئی کہ سرکاری ملازمین اور بعض پرائیویٹ اداروں کے ملازمین کو بھی تہواروں مثلاً دیوالی وغیرہ کے موقع پر بونس دیا جاتا ہے۔

بہ راہِ کرم وضاحت فرمائیں، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب: امامت کی اجرت کو متقدمین فقہاء احناف نے ناجائز کہا تھا۔ اس لیے کہ متعدد احادیث میں تعلیم قرآن پر اجرت حاصل کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن فقہائے متاخرین نے اس کے جواز کی رائے دی ہے۔ اس لیے کہ دینی معاملات میں تساہل در آنے کی وجہ سے تعلیم قرآن کے ضیاع کا اندیشہ ہے۔ (حاشیہ ابن عابدین، طبع دیوبند ۹/ ۶۵) درمختار میں ہے:

و یفتیٰ الیوم بصحتها لتعلیم القرآن و الفقه و الإمامة و الأذان۔

(ردمختار مع ردالمحتار، ۹/ ۶۵)

''آج کل قرآن وفقہ کی تعلیم اور امامت واذان کی اجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔''

کوئی شخص امامت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے اوقات گھر جاتے ہیں۔ گویا وہ جو کچھ اجرت لیتا ہے وہ نماز کی اجرت نہیں، بل کہ وقت کی اجرت ہوتی ہے۔ امام کو اگر ماہِ رمضان میں اس کے مشاہرے کے علاوہ کچھ اضافی رقم دی جاتی ہے تو یہ امامت کی اجرت نہیں، بل کہ اس کے ساتھ 'احسان' کا معاملہ ہے، جو پسندیدہ ہے۔ اگر امام نے خود کو مسجد کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور اس کے اوقات گھرے ہونے کی وجہ سے وہ کوئی دوسرا ذریعۂ معاش نہیں اختیار کرسکتا تو مسجد کی کمیٹی کے ذمہ داروں کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے اور حسبِ ضرورت اس کی امداد سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

نمازِ تراویح کا مخصوص طریقہ

سوال: ہمارے شہر کی ایک مسجد میں گزشتہ تین سالوں سے رمضان کی طاق راتوں میں تراویح کی

نماز اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ ہر چار رکعت کے بعد تقریباً ایک گھنٹے کا وقفہ دیا جاتا ہے، جس میں مختصر بیان ہوتا ہے اور مختلف اذکار پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً کبھی سورۂ یٰسٓ کی آیات، کبھی ایک ہی سانس میں بلند آواز سے ''اللہ اللہ'' اور کبھی ''ربی اسمی شیء اللّٰہ نبی محمد صلی علی'' پڑھایا جاتا ہے۔ درمیان میں مسجد ہی میں چائے پلائی جاتی ہے۔ اس طرح تراویح کی نماز ختم ہوتی ہے تو کچھ دیر کے بعد تہجد کی نماز باجماعت پڑھائی جاتی ہے۔ اس طرح سے سحری کا وقت ہو جاتا ہے۔ سحری کا نظم بھی مسجد میں ہوتا ہے۔

ان اعمال کے سلسلے میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان اعمال کو پسند نہیں کیا۔ اس مسجد میں عورتیں بھی تراویح کی نماز کے لیے آتی ہیں۔ ان میں سے کچھ نے شکایت کی کہ تراویح کی نماز اس طرح سحری تک نہ پڑھائی جائے۔ جب کہ کچھ لوگ اس کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ رمضان عبادت کا مہینا ہے۔ اس طرح لوگ فجر تک مسجد ہی میں رہتے ہیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ عبادت، ذکر و دعا اور دینی بیان سننے کا موقع ملتا ہے۔ جب امام صاحب سے اس بارے میں بات کی جاتی ہے تو وہ خفا ہو جاتے ہیں اور مسجد چھوڑ کر چلے جانے کی بات کرتے ہیں۔

بہ راہِ کرم وضاحت فرمائیں، مذکورہ بالا اعمال اور تراویح کا طریقہ کہاں تک درست ہے؟ کیا لوگوں کو فجر تک عبادت میں مشغول رکھنے کے لیے اس طرح تراویح پڑھنا صحیح ہے؟ یہ بھی بتائیں کہ نمازِ تہجد باجماعت پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: ماہِ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح مسنون ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کئی راتوں میں اس کا اہتمام کیا تھا اور مسجدِ نبوی میں صحابۂ کرام کے ساتھ باجماعت اس کو ادا فرمایا تھا۔ مگر پھر اس اندیشے سے کہ کہیں وہ فرض نہ ہو جائے، ترک کر دیا تھا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے بعد میں اپنے عہدِ خلافت میں اس کا اجراء فرمایا اور تمام صحابۂ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیا۔

نمازِ تراویح دو دو رکعتیں کر کے ادا کی جاتی ہے۔ ہر چار رکعت کے بعد کچھ دیر وقفہ کیا جاتا ہے۔ اسے ترویحہ کہتے ہیں۔ اسی بنا پر پوری نماز کو 'تراویح' کہا جاتا ہے۔ ترویحہ کو حسبِ ضرورت مختصر یا طویل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ذکر و تذکیر کرنا چاہیے۔ گزشتہ چار رکعات میں پڑھی گئی

آیات کا خلاصہ بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی مناسب ہے کہ نمازِ تراویح کے اختتام پر، قرآن کریم کا جتنا حصہ پڑھا گیا ہے، پورے کا خلاصہ ایک ساتھ بیان کر دیا جائے۔ نمازِ تراویح کا وقت وہی ہے، جو نمازِ عشاء کا ہے۔ یعنی اسے ابتدائی ایک تہائی شب میں ادا کرنا افضل ہے۔ البتہ اس کی ادائی طلوعِ فجر تک ہوسکتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ شب میں جماعت سے نماز پڑھی۔ آپؐ نے اتنی دیر تک نماز پڑھائی کہ ہمیں اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں ہماری سحری نہ چھوٹ جائے۔ (ابوداؤد: ۱۳۷۵، النسائی: ۱۳۶۴، ۱۶۰۵، ابن ماجہ: ۱۳۲۷)

لیکن ایسا اسی صورت میں کرنا چاہیے، جب تمام نمازی اس پر متفق ہوں۔ مسجد میں آنے والے اور نمازِ تراویح میں شریک ہونے والے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے، کم زور، بیمار، مزدور، تجارت پیشہ، خواتین وغیرہ۔ ان کے لیے پوری رات جاگنا دشواری کا باعث ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کے معاملے میں نمازیوں کی رعایت کرنے کی سخت تاکید کی ہے اور اس کا لحاظ نہ کرنے والوں پر اپنے انتہائی غضب کا اظہار کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ اپنے قبیلے کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ عشاء کی نماز میں وہ طویل قرأت کرتے تھے، جس کی بنا پر ان کی نماز طویل ہوجاتی تھی۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جاکر اس کی شکایت کی۔ اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم دن میں مختلف کام کرتے ہیں۔ اپنے جانوروں کے ذریعے کھیت سینچتے ہیں۔ معاذؓ رات کی نماز بہت طویل پڑھاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں دشواری ہوتی ہے۔ گزشتہ رات میں نے جماعت میں شریک ہونے کے بہ جائے انفرادی طور پر مختصر نماز پڑھ لی تو انھوں نے مجھے منافق کہہ دیا۔'' اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ کو بلا بھیجا اور ان کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: افتّان انت یا معاذ! (اے معاذ! کیا تم فتنہ پیدا کرنے والے ہو؟) یہ بات آپ نے تین بار دہرائی۔ (بخاری: ۷۰۱، ۶۱۰۶، مسلم: ۴۶۵)

ایک دوسری روایت حضرت ابومسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کی: میں صبح کی نماز جماعت سے اس لیے نہیں پڑھتا، کیوں کہ امام صاحب بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر آپؐ نے سخت غصے کا اظہار فرمایا۔ اتنے غصے میں اس سے پہلے کبھی میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ مِنكُم مُنَفِّرِينَ فَاَيُّكُمْ مَا صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ فَاِنَّ فِيهِمُ الْمَرِيضَ وَالْكَبِيرَ وَ ذَا الْحَاجَةِ۔

(بخاری: ۶۱۱۰، مسلم: ۴۶۶)

''لوگو! تم میں سے بعض لوگ دوسروں کو متنفر کرنے والے ہیں۔ تم میں سے جو شخص امامت کرے، اسے نماز مختصر پڑھانی چاہیے، اس لیے کہ مقتدیوں میں مریض، بوڑھے اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔''

جب فرض نمازوں میں مقتدیوں کی رعایت کرنے اور انھیں مختصر پڑھانے کی اتنی تاکید ہے تو ان کا لحاظ کیے بغیر پوری رات میں نمازِ تراویح کو طویل کرنا کیوں کر پسندیدہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

نمازِ تراویح کے وقفوں کے دوران مسنون اذکار کا اہتمام کرنا چاہیے۔ آپ نے لکھا ہے کہ بلند آواز سے ''ربی اسمی...'' پڑھا جاتا ہے۔ یہ ذکر پتا نہیں کہاں سے ایجاد کرلیا گیا ہے۔ اس کی تو عبارت بھی صحیح نہیں ہے۔

نمازِ تہجد نفل ہے اور نفل نماز جمہور فقہاء کے نزدیک انفرادی طور پر اور باجماعت دونوں طرح ادا کی جاسکتی ہے۔ نبی ﷺ سے نفل نماز کی ادائی بعض مواقع پر جماعت کے ساتھ ثابت ہے۔ احناف کے نزدیک رمضان کے علاوہ دیگر ایام میں نفل کی باجماعت ادائی مکروہ ہے۔ (الموسوعة الفقهية، کویت، ۲۷/ ۱۶۹)

تعمیرِ مسجد میں غیر مسلم کا مالی تعاون

سوال: ہمارے شہر کی جامع مسجد کے لیے ایک ہندو صاحب اپنی خوشی سے بورویل ڈلوانا چاہتے ہیں۔ ان کے زراعت اور سونے چاندی کے کاروبار ہیں۔ انکار کے باوجود وہ صاحب مصر ہیں کہ ثواب کے کام میں میرا پیسہ استعمال کرکے مسجد کے لیے بورویل ڈلوالو۔ شریعتِ مطہرہ میں اس کا کیا حکم ہے؟ بہ راہِ کرم جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: اسلامی شریعت نے غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھنے کی اجازت دی ہے۔ یہ

تعلقات دو طرفہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً غیر مسلموں کو کھانے پینے کی دعوت دی جاسکتی ہے اور ان کی دعوت قبول بھی کی جاسکتی ہے۔ محتاج اور ضرورت مند غیر مسلموں کی مالی امداد کی جاسکتی ہے اور مال دار غیر مسلموں کی جانب سے مالی امداد قبول بھی کی جاسکتی ہے۔ غیر مسلموں سے کاروباری تعلقات رکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے یہاں ملازمت کی جاسکتی ہے اور انھیں بھی اپنے یہاں ملازم رکھا جاسکتا ہے۔ انھیں تحفے تحائف دیے جاسکتے ہیں اور ان کا تحفہ بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔ مختلف سماجی، رفاہی اور دیگر کاموں میں ان کا مال و اسباب بھی قبول کیا جاسکتا ہے اور ان سے خدمات بھی لی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے اسوے سے رہ نمائی ملتی ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے سفر میں حضرت ابوبکرؓ نے عبد اللہ بن اریقط نامی ایک غیر مسلم کی خدمات حاصل کی تھیں اور آں حضرت ﷺ نے اس کی رہ نمائی میں ہجرت کی تھی۔ غزوۂ حنین کے موقع پر آپؐ نے صفوان بن امیہ سے، جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، سو سے زائد زرہیں اور گھوڑے وغیرہ عاریتاً حاصل کیے تھے۔ اسی طرح آپؐ نے متعدد مرتبہ سربراہانِ مملکت سے تحائف قبول کیے تھے۔

اسی طرح مساجد و مدارس وغیرہ کی تعمیر یا ان سے متعلق دیگر کاموں میں غیر مسلموں سے مالی تعاون قبول کرنا جائز ہے۔ بس یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ مال جائز اور حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو، اس میں حرام کمائی شامل نہ ہو، اسے قبول کرنا مساجد اور مدارس کے مصالح کے خلاف نہ ہو اور مالی تعاون کرنے والے کا مقصد آئندہ احسان جتانا ہو نہ اپنا کوئی کام نکالنا یا کوئی دباؤ ڈالنا۔ ان شرائط کے ساتھ علما نے غیر مسلموں کا مالی تعاون لینے کی اجازت دی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے امداد الفتاویٰ، ۲/ ۶۶۴) البتہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر یا مذہبی میلے وغیرہ کے انتظام میں مالی تعاون دینا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ گناہ کے کاموں میں تعاون ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ (المائدۃ: ۲)

تدفین کے وقت قبر پر مٹی ڈالنا

سوال: مردے کو قبر میں دفن کرتے وقت تین مرتبہ مٹی ڈالی جاتی ہے اور اس کے ساتھ دعا بھی پڑھی جاتی ہے۔ بہ راہِ کرم اس کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں۔ کیا تین مرتبہ مٹی ڈالنا ضروری ہے؟ اس کے ساتھ جو دعا پڑھی جاتی ہے، کیا وہ اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے؟

جواب: مردے کو قبر میں دفن کرتے وقت تین مرتبہ مٹی ڈالنا مسنون ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے تین مرتبہ مٹی ڈالی۔

(ابن ماجہ: ۱۵۶۵، علامہ البانیؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے)

ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ) کے نزدیک مٹی ڈالتے وقت مستحب یہ ہے کہ پہلی مرتبہ مِنهَا خَلَقنَاكُم، دوسری مرتبہ وَ فِيهَا نُعِيدُكُم اور تیسری مرتبہ وَ مِنهَا نُخرِجُكُم تَارَةً اُخرٰى پڑھے۔ (یہ اصلاً سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۵۵ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے) اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثومؓ کو دفن کرتے وقت ایسا کیا تھا۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ''مٹی ڈالتے وقت کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ حدیث مذکور ضعیف ہے۔''

(ملاحظہ کیجیے: فقہ السنۃ، السید سابق، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۳ء، ۱/۵۴۶)

رقمِ زکوٰۃ سے اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائی

سوال: ہماری سوسائٹی کے تحت صوبے کے مختلف شہروں، قصبات اور دیہاتوں میں تعلیمی ادارے چلتے ہیں۔ اگرچہ طلبہ سے فیس لی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود بیش تر اداروں میں ماہانہ وسالانہ خسارہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تعمیر و مرمت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ اصحابِ خیر سے تعاون کی اپیل کی جاتی ہے تو جو رقمیں حاصل ہوتی ہیں وہ بالعموم زکوٰۃ کی ہوتی ہیں۔ اگر اس رقم سے خسارہ پورا نہ کیا جائے اور اسے تعمیر و مرمت میں نہ لگایا جائے تو پھر کوئی اور صورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ یہ ادارے ختم یا بے اثر ہو جائیں۔ یہ صورت حال اس کے باوجود ہے کہ نادار اور غریب طلبہ کی فیس وغیرہ زکوٰۃ کی مد سے ادا کی جاتی ہے۔

بعض حضرات اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم اساتذہ کی تنخواہوں اور تعمیرات و مرمت پر صرف نہیں کی جاسکتی۔ بہ راہ کرم اس سلسلے میں ہماری رہ نمائی فرمائیں کہ کیا کیا جائے؟

جواب: زکوٰۃ کے مصارف قرآن کریم کی سورہ توبہ آیت ۶۰ میں بیان کیے گئے ہیں۔ان میں سے ایک مصرف 'فی سبیل اللہ' ہے۔اس پر ماضی میں بڑی معرکہ آرا بحثیں ہوئی ہیں۔ان بحثوں کے نتیجے میں تین قسم کی آراء سامنے آئی ہیں:

۱- تطبیق (اس مد کو محدود تر کرنا) علماء کی اکثریت 'فی سبیل اللہ' کو جہاد (عسکری جہاد) کے معنیٰ میں لیتی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ صدرِ اول سے اب تک تمام محدثین، مفسرین، فقہا سے یہی منقول ہے۔گویا اس پر امت کا اجماع ہے۔اس سے ہٹ کر جو رائیں منقول ہیں وہ شاذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

۲- تعمیم (اس مد کو وسیع تر کرنا): بعض علماء اس سے تمام 'وجوہ خیر' مراد لیتے ہیں اور ہر اچھے کام کو زکوٰۃ کا مصرف قرار دیتے ہیں۔

۳- توسیع: علماء کے ایک طبقے نے بین بین کی راہ اختیار کی ہے۔وہ نہ تو ایسی تعمیم کا قائل ہے جو دین کے نام پر ہونے والے ہر کام کو محیط ہو اور نہ اس کے نزدیک ایسی تنگی ہے کہ اس مصرف کے تحت مال زکوٰۃ کو قتال کے علاوہ احیائے دین کے کسی کام پر خرچ نہ کیا جا سکتا ہو۔اس رائے کے حاملین فی سبیل اللہ کو جہاد فی سبیل اللہ کے معنیٰ میں لیتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک جہاد اپنے درجات اور مراحل کے اعتبار سے عسکری نوعیت کا بھی ہوتا ہے اور نظری و فکری بھی۔غرض خالصۃً اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد سے کی گئی ہر جد و جہد پر فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوگا۔

عصرِ حاضر کے بعض علماء جو پہلی رائے رکھتے ہیں، وہ دوسری یا تیسری رائے رکھنے والوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔وہ اسے ''مغربی تہذیب سے مرعوب اور مغربی عقلیت کے شکار بعض لوگوں کی ذہنی اختراع'' قرار دیتے ہیں (ملاحظہ کیجیے زکوٰۃ کے مصارف از مولانا عتیق احمد بستوی، مکتبہ حرا لکھنؤ، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۵-۱۶) لیکن یہ بات صحیح نہیں، بل کہ اس کے قائل متقدمین میں بھی بعض لوگ رہے ہیں۔فقہائے احناف میں ملک العلماء علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی (م ۵۸۷ھ) اور ظہیر الدین ابوبکر محمد بن احمد (۶۱۹ھ) تعمیم کے قائل ہیں۔تفسیر رازی کے بہ موجب

شافعی فقیہ محمد بن علی بن اسماعیل المعروف بالقفال الکبیر (م ۳۶۵ھ) نے بھی بعض فقہاء کی جانب اس قول کو منسوب کیا ہے۔

اس موضوع پر عصرِ حاضر کی بعض اکیڈمیوں کے فیصلوں پر نظر ڈالنی مفید ہوگی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا پانچواں فقہی سمینار جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ میں ۳۱/اکتوبر تا ۳/نومبر ۱۹۹۲ء منعقد ہوا تھا۔ اس میں یہ موضوع بھی زیرِ بحث تھا۔ عام شرکاء سمینار کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سورہ توبہ آیت ۶۰ میں مذکور فی سبیل اللّٰہ کا مصداق غزوہ اور جہادِ عسکری ہے۔ دورِ حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لیے درکار سرمایہ کی فراہمی میں پیش آنے والی دشواری کے باوجود شرعاً اس کی گنجایش نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کر کے اس میں تمام دینی اور دعوتی کاموں کو شامل کر لیا جائے۔ کیوں کہ قرونِ اولیٰ میں اس تعمیم و توسیع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نیز ایسا کرنے سے مسلمانوں کے محتاج، نادار اور افلاس زدہ طبقہ کی مالِ زکوٰۃ کے ذریعے کفالت کا اہم ترین مقصد فوت ہو جائے گا۔ شرکائے سمینار میں سے تین حضرات (جناب شمس پیرزادہ ممبئی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، علی گڑھ، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی علی گڑھ) نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ ان کے نزدیک فی سبیل اللہ میں عسکری جہاد کے ساتھ وہ تمام کوششیں شامل ہیں، جو آج کے دور میں واقعتہً دعوتِ اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کی جا رہی ہوں۔ (مجلّہ فقہ اسلامی جزء دوم، قاضی پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۹۴ء، ص: ۹۵۶-۹۵۷)

سعودی عرب کے ممتاز علماء و فقہاء پر مشتمل ایک ادارہ ھیئۃ کبار العلماء کے نام سے قائم ہے۔ اس کے پانچویں اجلاس منعقدہ طائف ۵-۲۳/شعبان ۱۳۹۴ھ (اگست ۱۹۷۴ء) میں زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا موضوع بھی شامل تھا۔ اس اجلاس کے شرکاء نے یہ فیصلہ دیا کہ زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق صرف مجاہدین ہیں۔ تمام امورِ خیر اس میں شامل نہیں ہیں۔

(زکوٰۃ کے مصارف، ص: ۱۸۲-۱۸۳، بہ حوالہ مجلۃ البحوث الاسلامیۃ، ریاض، ج ۱، ش ۲)

البتہ عالمِ اسلامی کی ایک دوسری فقہی اکیڈمی کا فیصلہ اس سے مختلف ہے۔ المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ رابطہ عالم اسلامی کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ اس کا آٹھواں

اجلاس ۲۸ / ربیع الثانی تا ۷ / جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ مکہ مکرمہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں اس موضوع پر غور کیا گیا کہ مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق صرف اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں یا فی سبیل اللہ کا مفہوم عام ہے؟ غور وخوض کے بعد محسوس کیا گیا کہ اس مسئلے میں علما کی دو آراء ہیں۔ موضوع پر غور اور فریقین کے دلائل پر مناقشے کے بعد اکثریت کی رائے سے درج ذیل فیصلے کیے گئے:

(۱) دوسری رائے کو بعض علمائے اسلام نے اختیار کیا ہے اور قرآن کریم کی بعض آیات میں یک گونہ اس مفہوم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۲) جہاد بالسلاح کا مقصود چوں کہ اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ جس طرح قتال سے ہوتا ہے، اسی طرح داعیوں کی تیاری اور ان کی مدد اور تعاون کے ذریعے دعوت الی اللہ اور اشاعتِ دین سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں طریقے جہاد ہی کے ہیں۔

(۳) اسلام پر آج ملحدین، یہود و نصاریٰ اور دشمنان دین کی طرف سے فکری اور عقائدی حملے ہو رہے ہیں اور دوسروں کی طرف سے انھیں مادی اور معنوی مدد مل رہی ہے۔ ان حالات میں انتہائی ضروری ہے کہ مسلمان ان کا مقابلہ انھی ہتھیاروں سے کریں، جن سے وہ اسلام پر حملے کرتے ہیں یا ان سے سخت ہتھیار سے مقابلہ کریں۔

(۴) اسلامی ممالک میں جنگوں کے لیے مخصوص وزارتیں ہوتی ہیں اور ہر ملک کے بجٹ میں ان کے لیے مالی ضوابط ہوتے ہیں، جب کہ دعوتی جہاد کے لیے بیش تر ممالک کے بجٹ میں کوئی تعاون و مدد بھی نہیں ہوتی ہے۔

ان مذکورہ بالا امور کے پیش نظر اکثریت کی رائے یہ طے کرتی ہے کہ دعوت الی اللہ اور اس کے معاون اعمال آیتِ کریمہ میں مذکور زکوٰۃ کے مصرف فی سبیل اللہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

نوٹ: شیخ صالح بن فوزان، شیخ محمد بن عبد اللہ السبیل، شیخ محمد رشید قبانی اور ڈاکٹر بکر ابوزید کو مذکورہ قرارداد سے اتفاق نہیں ہے اور ان حضرات کی رائے میں فی سبیل اللہ کو صرف عسکری مجاہدین کے لیے مخصوص رکھنا ضروری ہے۔ شیخ محمد محمود صواف کو قرارداد سے اتفاق ہے، بل کہ ان

کی رائے میں یہ توسع اس قدر ہے کہ اللہ کی راہ میں انجام پانے والے خیر کے تمام کام شامل ہیں۔

(فقہی فیصلہ، طبع دہلی، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۷۳، ۱۷۴)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ مصرف فی سبیل اللہ کو کچھ علماء عسکری جہاد کے لیے خاص کرتے ہیں تو کچھ دعوت و اشاعت دین کے کاموں کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں اور کچھ ہر اچھے کام کو مصرفِ زکوٰۃ قرار دیتے ہیں۔

ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ جو علماء مصرف فی سبیل اللہ کے عموم کے قائل نہیں ہیں، وہ بھی عملاً اموالِ زکوٰۃ کو ہر طرح کے دینی کاموں میں خرچ کرتے ہیں، البتہ وہ اس کے لیے ایک 'حیلہ' اختیار کرتے ہیں۔ اسے انھوں نے 'حیلۂ تملیک' کا نام دیا ہے۔ یعنی پہلے کسی مستحقِ زکوٰۃ کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے، پھر وہ اپنی طرف سے اس مال کو دینی کاموں میں خرچ کرنے کے لیے دے دے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، جو آج کل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے سکریٹری اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن ہیں، انھوں نے اپنی کتاب 'اسلام کا نظامِ عشر و زکوٰۃ' میں لکھا ہے:

> ''البتہ اگر کہیں ایسے ضروری اقدامات موجود ہوں جو دینی اور قومی ضروریات کے اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہوں، لیکن زمامِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو اور نہ ایسا بیت المال موجود ہو، جس میں مختلف مدات کے لیے رقوم ہوں تو ایک شرعی دینی ضرورت کی تکمیل کے لیے اس میں کوئی قباحت نہیں کہ بالواسطہ طور پر زکوٰۃ کی رقم اس مد میں صرف کی جائے۔ اسی کو 'حیلۂ تملیک' کہا جاتا ہے۔
>
> اس میں کوئی قباحت نہیں کہ ضروری دینی اور قومی کاموں کے لیے کسی فقیر محتاج اور مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنا دیا جائے، پھر وہ ان ضروریات میں اس رقم کو خرچ کرے۔
>
> دینی مدارس میں جو رقوم صرف ہوتی ہیں ان میں حیلۂ تملیک سے بہ سہولت بچا جا سکتا ہے۔ مہتمم، سفراء اور منتظمین کی تنخواہیں تو اس لیے دی جا سکتی ہیں کہ فقہاء نے 'عاملین' میں زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کرنے والوں اور نظم و نسق انجام دینے والوں کو بھی شامل رکھا ہے۔ طلبہ کو جو کھانے دیے جاتے ہیں اگر وہ تقسیم کر کے طلبہ کو مالک بنا دیا جائے تو اس سے بھی زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ ضروریات کے لیے جو وظائف دیے جاتے ہیں،

اس میں بھی تملیک پائی جاتی ہے اور زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔ رہ گئی اساتذہ کی تنخواہیں اور دوسری مدات تو اگر طلبہ کو تعلیمی وظائف کی رقم دی جائے اور ان سے فیس وصول کرلی جائے تو اب حیلۂ تملیک کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔''

''حیلۂ تملیک کے اس طریقے سے ان ضروریات کے لیے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جو فی زمانہ اسلام کی سربلندی کے لیے پیدا ہوگئی ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف پر نظر ڈالنے سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کے بنیادی مقاصد حاجت مندوں کی ضروریات کی تکمیل اور اسلام کی سربلندی ہے۔ آج اسلام کی سربلندی کے لیے جو وسائل مطلوب ہیں، وہ ماضی سے بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔ ان مقاصد کے لیے تملیک کے حیلے کے ذریعے بالواسطہ زکوٰۃ کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا مزاجِ شریعت کے عین مطابق ہے۔''

(اسلام کا نظامِ عشر و زکوٰۃ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مرکز دعوت و تحقیق حیدرآباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۵، ۱۳۶)

دار العلوم دیوبند کے مفتیِ اول مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے ایک صاحب نے ''عملہ و دفتر، انجمن ہائے تبلیغ و حفاظت اسلام'' کی تنخواہ اور مصارف خوراک و سفر پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کی بابت سوال کیا۔ مفتی صاحب نے اس کا یہ جواب دیا:

''غرض یہ ہے کہ فی سبیل اللہ میں بے شک موافق تفسیر صاحب بدائع کے جملہ مصارفِ خیر داخل ہیں۔ لیکن جو شرط اداءِ زکوٰۃ کی ہے وہ سب جگہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ بلا معاوضہ تملیک محتاج کی ہونی ضروری ہے۔ اس میں حیلۂ تملیک اول کرلینا چاہیے، تاکہ تملیک کے بعد تبلیغ وغیرہ کے ملازمین کی تنخواہ وغیرہ میں صرف کرنا اس کا درست ہوجائے۔''

(حوالہ سابق، ص ۱۳۶، ۱۳۷، بہ حوالہ فتاویٰ دار العلوم ۶/ ۲۸۳)

اس تفصیل سے واضح ہوجاتا ہے کہ رقومِ زکوٰۃ وقتِ ضرورت اساتذہ کی تنخواہوں اور مدرسہ کے دیگر کاموں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہیں۔

کیا حج سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں؟

سوال: عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ حج کے بعد حاجی گناہوں سے ایسا پاک ہوجاتا ہے گویا

وہ آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ بہ طور دلیل یہ حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو شخص اللہ کی خوش نودی کے لیے حج کرے اور (اثنائے حج) فحش گوئی سے بچے اور نافرمانی نہ کرے تو وہ ایسا بے گناہ ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن بے گناہ تھا، جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔'' لیکن بعض کتابوں میں میں نے یہ لکھا ہوا پایا ہے کہ حج ادا کرنے سے کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے، ان کی سزا بہر حال مل کر رہے گی۔

اس تضاد کی وجہ سے میں الجھن کا شکار ہو گیا ہوں۔ بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب: آپ نے جو حدیث درج کی ہے وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ اس کا متن یہ ہے:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ.

یہ حدیث سنن ابی داؤد کے علاوہ صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ (ملاحظہ کیجیے: بخاری: ۱۵۲۱، ۱۸۱۹، ۱۸۲۹، مسلم: ۱۳۵۰، ترمذی: ۸۱۰، نسائی: ۲۶۲۸، ابن ماجہ: ۲۸۸۹) امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اسے متعدد مقامات پر روایت کیا ہے۔ (۲/۲۲۹، ۲۴۸، ۴۱۰، ۴۸۴، ۴۹۴) امام طبریؒ نے بھی اپنی تفسیر میں مختلف سندوں سے اس کی روایت کی ہے (تفسیر طبری، دار المعارف مصر، ۴/۱۵۰-۱۵۲) بعض روایتوں میں حدیث کے آخری حصے کے الفاظ کچھ مختلف ہیں، مثلاً رَجَعَ كَمَا وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ، خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ وغیرہ۔ اس حدیث کا ظاہری مفہوم، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی لکھا ہے، یہ ہے کہ حج سے انسان کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ یا ان کا تعلق حقوق سے ہو (فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعارف مصر، ۳/۳۸۲) لیکن دیگر احادیث بھی پیش نظر رہیں تو یہ مفہوم صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے جس سند سے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

(ترمذی، ابواب الحج عن رسول الله ﷺ، باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرة، ۸۱۰)

غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے) کی

بشارت دین کے دوسرے بہت سے کاموں پر بھی دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض کام عظیم الشان ہیں تو بعض معمولی درجے کے۔ مثلاً اذان سن کر کلمۂ شہادت پڑھنا، خوب اچھی طرح وضو کر کے حضور قلب کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھنا، نماز چاشت ادا کرنا، نماز باجماعت میں امام سورۂ فاتحہ پڑھ چکے تو اس کے ساتھ آمین کہنا اور وہ رکوع سے اٹھتے وقت سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه کہے تو رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہنا، ماہ رمضان میں دن میں روزہ رکھنا اور شب میں قیام کرنا، شب قدر میں عبادتوں کا اہتمام کرنا وغیرہ۔ علماء نے ان احادیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ ان میں جن گناہوں کی معافی کا تذکرہ ہے، ان سے مراد صغائر ہیں نہ کہ کبائر (المراد بالغفران الصغائر دون الکبائر) (شرح مسلم للنووی، دار الریان القاہرۃ، ۳/ ۱۰۸)

بعض دیگر احادیث میں اس کی صراحت بھی ملتی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرمایا کرتے تھے:

اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَ رَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتُ مَا بَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرِ۔ (مسلم: ۲۳۳)

”کوئی شخص روزانہ پنج وقتہ نمازیں ادا کرے، ہر جمعہ کی نماز پڑھے اور ہر رمضان کے روزے رکھے تو ان کی بہ دولت ان عبادات کے درمیانی عرصے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اگر وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے۔“

اسی بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ جن احادیث میں غَفَرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ کے الفاظ آئے ہیں ان میں صغائر سے معافی مراد ہے نہ کہ کبائر سے۔ اسی مضمون کی ایک حدیث کی تشریح میں حدیث بالا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ فرماتے ہیں:

”اس حدیث سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تمام پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے، لیکن علماء نے انھیں صرف صغائر پر محمول کیا ہے، اس لیے کہ بعض دیگر احادیث میں کبائر کا استثناء کیا گیا ہے۔“ (تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، مکتبہ اشرفیہ دیوبند، ۲/ ۷۰)

شارح صحیح بخاری علامہ قسطلانیؒ (م ۹۲۳ھ) نے زیر بحث حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

”رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک و

صاف ہو جائے گا جس طرح اس دن اس پر کوئی گناہ نہیں تھا، جب وہ پیدا ہوا تھا۔ اس میں صغائر، کبائر اور حقوق سب شامل ہیں۔ یہ بات حافظ ابن حجرؒ نے کہی ہے۔ تائید میں انھوں نے بعض دیگر احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن طبریؒ فرماتے ہیں کہ حقوق کی پامالی کے سلسلے میں اسے اس شخص پر محمول کیا جائے گا، جو اس کی تلافی پر قادر نہ ہو، لیکن اسے توبہ کی توفیق مل گئی ہو۔ ترمذیؒ نے لکھا ہے کہ یہ بشارت مخصوص ہے ان گناہوں کے سلسلے میں جو خاص طور پر حقوق اللہ سے متعلق ہیں۔ اس سے حقوق العباد ساقط نہیں ہوں گے، بل کہ ان اعمال سے تو حقوق اللہ بھی ساقط نہیں ہوں گے۔ چناں چہ اگر کسی شخص کے ذمے نماز یا کسی چیز کا کفارہ یا حقوق اللہ میں سے کوئی دوسرا حق باقی ہو تو وہ اس سے ساقط نہیں ہوگا۔ معافی کی بات گناہوں کے سلسلے میں کہی گئی ہے نہ کہ حقوق کے سلسلے میں۔ گناہ ان حقوق کی ادائی میں تاخیر کرنے سے لازم آتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے حج واجب ہو جانے کے باوجود اس کی ادائی میں تاخیر کی تو گناہ گار ہوگا۔ یہ گناہ ادائے حج سے ساقط ہو جائے گا۔ یہی معاملہ دیگر حقوق کا ہے کہ ایک بار ان کی ادائی کے بعد اگر بعد میں پھر ان کی ادائی میں تاخیر اور کوتاہی کی گئی تو اس کا گناہ لازم ہوگا۔ پس حج مبرور سے مخالفت کا گناہ ساقط ہوتا ہے، نہ کہ حقوق کی عدم ادائی کا۔''

(ارشاد الباری شرح صحیح البخاری، مطبع نول کشور، کان پور، ۳/۷۹)

کبیرہ گناہوں سے معافی کے لیے توبہ ضروری ہے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے:

''علماء فرماتے ہیں: توبہ ہر گناہ کے سلسلے میں لازم ہے۔ اگر معصیت کا معاملہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو اور اس کا تعلق کسی انسان کے حق سے نہ ہو تو اس سے توبہ کی تین شرائط ہیں: (۱) گناہ کرنے والا اس معصیت سے باز آجائے۔ (۲) اس کے ارتکاب پر نادم ہو۔ (۳) عزم کرے کہ پھر کبھی اس کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اگر ان تین شرائط میں سے کوئی شرط نہیں پائی جائے گی تو توبہ صحیح نہیں ہوگی اور اگر معصیت کا تعلق کسی انسان سے ہو تو مذکورہ شرائط کے ساتھ ایک چوتھی شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ اس نے صاحبِ حق کا جو حق پامال کیا ہے اس کی تلافی کرے۔ اگر مال یا کسی دوسری چیز پر ناحق قبضہ جمایا ہے تو اسے واپس کرے۔ کسی پر کوئی بے جا الزام یا تہمت لگائی ہو تو اسے اختیار دے کہ اس سے بدلہ لے لے یا اسے معاف کر دے۔ غیبت کی ہو تو اس سے معافی مانگ لے۔ ضروری ہے کہ آدمی تمام گناہوں پر توبہ کرے۔ اگر وہ اپنے

> صرف بعض گناہوں کے سلسلے میں توبہ کرتا ہے تو اہل حق کے نزدیک صرف انھی گناہوں پر اس کی توبہ مقبول ہوگی اور دیگر گناہ اس کے ذمے باقی رہیں گے۔ وجوب توبہ پر کتاب وسنت میں بہ کثرت دلائل موجود ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے۔
>
> (ریاض الصالحین، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۷۳، ص:۱۰-۱۱، باب التوبۃ)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حج سے انسان کے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہوں سے معافی کے لیے توبہ ضروری ہے اور اگر حاجی نے پہلے کسی انسان کا حق پامال کر رکھا ہو تو اس کی معافی کے لیے اس کی تلافی بھی ضروری ہے۔ زیر بحث حدیث کی تشریح میں علامہ ابن العربی مالکیؒ نے یہی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''ہم نے متعدد مقامات پر یہ بات لکھی ہے کہ طاعات صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں، نہ کہ کبیرہ گناہوں کا۔ جب نماز کبائر کا کفارہ نہیں بنتی تو عمرہ، حج اور قیام رمضان کیسے کبائر کا کفارہ بن سکتے ہیں؟ ہاں یہ عبادات بسا اوقات دل پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ ان سے انسان کو سچی توبہ کی توفیق مل جاتی ہے اور یہ توبہ اس کے ہر گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے۔'' (عارضۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، دار الاحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵ جلد چہارم، ص:۲۶)

حج بدل

سوال: کیا حجِ بدل کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے، جس نے خود پہلے حج نہ کیا ہو؟

جواب: کسی شخص پر حج فرض ہو گیا ہو اور وہ مرض، بڑھاپا یا کسی اور وجہ سے حج نہ کر سکے، تو وہ دوسرے شخص کو اپنی جگہ حج پر بھیج سکتا ہے۔ اسے حج بدل کہتے ہیں۔ حجِ بدل زندہ شخص کی طرف سے بھی کیا جا سکتا ہے اور میت کی طرف سے بھی۔

حضرت فضل بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعے پر قبیلۂ خثعم کی ایک عورت نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: اللہ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے۔ میرے باپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اتنے کہ سواری پر ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آں حضرت ﷺ نے جواب دیا: ہاں۔

(بخاری: ۱۵۱۳، مسلم: ۱۳۳۴)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی، لیکن اس کا انتقال ہوگیا اور وہ حج نہ کرسکی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، اس کی طرف سے حج کرو۔ آپؐ نے مزید فرمایا: ''اگر تمھاری ماں پر کسی کا قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا نہ کرتیں؟ یہ اللہ کا قرض ہے۔ اس کا زیادہ حق ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔'' (بخاری: ۱۸۵۲)

ان احادیث کی بنا پر جمہور فقہاء (احناف، شوافع اور حنابلہ) حجِ بدل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ مالکیہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک حج بدنی عبادت بھی ہے۔ اسے کسی شخص کی طرف سے کوئی دوسرا شخص ادا نہیں کرسکتا۔

جس شخص نے خود حج نہ کیا ہو، کیا وہ دوسرے شخص کی طرف حج کرسکتا ہے؟ اس سلسلے میں حجِ بدل کے جواز کے قائل فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ شوافع اور حنابلہ کہتے ہیں کہ حجِ بدل صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو پہلے اپنا حج کر چکا ہو۔ دلیل میں وہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث پیش کرتے ہیں، جس میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''شبرمہ کی طرف سے لبیک'' آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا: یہ شبرمہ کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میرا بھائی۔ آپؐ نے پھر سوال کیا: کیا تم اپنا حج کر چکے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: پہلے اپنا حج کرو، پھر شبرمہ کی طرف سے کرنا۔'' (ابوداؤد: ۱۸۱۱، ابن ماجہ: ۲۹۰۳)

احناف کے نزدیک جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو وہ بھی حجِ بدل کرسکتا ہے۔ لیکن ایسے شخص سے حج کرانا مکروہ ہے۔ اگر اس پر اپنا حج واجب ہو تو اس سے حج کرانا مکروہ تحریمی اور واجب نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے۔ وہ جواز کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے خثعمی عورت سے کوئی تفصیل دریافت نہیں فرمائی تھی کہ وہ اپنا حج کر چکی ہے یا نہیں، اور اس سے مطلقاً فرمایا تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے حج کرے۔

قربانی کے بعض مسائل

سوال: قربانی کے بارے میں بسا اوقات طرح طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں، جن کی بنا پر ذہن الجھن کا شکار ہو جاتا ہے، بہ راہِ کرم شریعت کی روشنی میں رہ نمائی فرمائیں:

۱- کیا کسی مرحوم شخص کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے؟ بعض حضرات اس پر اشکال وارد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی میت کے نام سے قربانی جائز نہیں ہے۔

۲- بعض حضرات اپنے علاوہ اپنے بیوی بچوں، ماں باپ اور دیگر اعزّہ کی طرف سے بھی قربانی کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کئی چھوٹے جانور ذبح کرتے ہیں یا بڑے جانوروں میں کئی حصے لیتے ہیں۔ بیوی اگر صاحب نصاب ہو تو کیا اس کا الگ سے قربانی کروانا ضروری ہے؟

۳- بعض حضرات سے یہ بھی سننے کو ملا کہ جانور کا خصی کرانا اس میں عیب پیدا کرتا ہے۔ حدیث میں عیب دار جانور کی قربانی سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے خصی کیے گئے جانور کی قربانی جائز نہیں۔

جواب: آپ کے دریافت کیے گئے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ ایک اپنی طرف سے اور دوسری اپنی امت کے ان لوگوں کی طرف سے جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے قربانی نہ کر سکے ہوں۔ اس حدیث کو ابو یعلی اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور ہیثمی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے ایک مرتبہ دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ ان کے شاگرد حنش نے دریافت کیا کہ یہ دوسرا کس کی طرف سے ہے؟ فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے۔ آپؐ نے مجھے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ اس لیے میں برابر ایسا ہی کرتا ہوں۔ (ابوداؤد: ۲۷۹۰، ترمذی: ۱۴۹۵) امام ترمذی نے اس روایت کو 'غریب' کہا ہے۔ علامہ البانی نے ابوداؤد اور ترمذی دونوں کی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم میت کی طرف سے قربانی کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں: میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ میت کی طرف سے قربانی نہ کی جائے، بل کہ اس کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے۔ اور اگر قربانی کی جائے تو قربانی کرنے والا اس کا کچھ بھی گوشت نہ کھائے، بل کہ سب صدقہ کر دے۔ (ترمذی، ابواب الاضاحی، باب ماجاء فی الأضحیة عن المیت)

فقہاء میں سے احناف اور حنابلہ میت کی طرف سے قربانی کرنے کو مطلق اور مالکیہ کراہت کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ شوافع اسے ناجائز کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک میت کی طرف سے اسی صورت میں قربانی کی جاسکتی ہے جب میت نے اس کی وصیت کی ہو یا وقف کیا ہو۔

جواز کے قائلین کا استدلال یہ ہے کہ مالی عبادت دوسرے شخص کی طرف سے کی جاسکتی ہے۔ چناں چہ جس طرح صدقہ یا حج میت کی طرف سے کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اس کی طرف سے قربانی بھی کی جاسکتی ہے۔ دوسرے کی طرف سے قربانی کرنے والا اسی طرح اس کے گوشت کو کھا سکتا ہے، جس طرح وہ اپنی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے۔ البتہ اگر میت نے قربانی کی وصیت کی ہو تو پورے گوشت کو صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

۲- ایک شخص اپنی طرف سے ایک جانور کی بھی قربانی کرسکتا ہے اور ایک سے زائد جانوروں کی بھی۔ اسی طرح وہ اپنے متعلقین کی جانب سے بھی قربانی کرسکتا ہے اور پورے گھر والوں کی طرف سے ایک جانور کی قربانی بھی کفایت کرسکتی ہے۔ احادیث میں ہر صورت کا بیان موجود ہے:

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے انھیں ذبح کیا۔

(بخاری:۵۵۵۸، مسلم:۱۹۶۶)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے اور دیگر ازواجِ مطہرات کے سفرِ حج کے احوال بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ آپؐ نے اپنی ازواج کی طرف سے گایوں کی قربانی کی۔ (بخاری:۵۵۵۹، مسلم:۱۲۱۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مینڈھے کی قربانی کی۔ اسے ذبح کرتے وقت آپؐ نے یہ دعا پڑھی: ''اے اللہ اسے قبول کر لے، محمد کی طرف سے، آلِ محمد کی طرف سے اور امت محمد کی طرف سے'' (مسلم:۱۹۶۷) دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ ایک محمد اور آل محمد کی طرف سے اور دوسرا امتِ محمد کی طرف سے۔ (ابنِ ماجہ:۳۱۲۲)

عطا بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میں نے صحابیِ رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے دریافت کیا: عہدِ رسول میں کس طرح قربانیاں کی جاتی تھیں؟ انھوں نے جواب دیا: اس زمانے میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری ذبح کرتا تھا۔ تمام لوگ خود کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ بعد میں لوگوں میں فخر و مباہات کے طور پر زیادہ سے زیادہ جانوروں کی قربانی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ان کا ویسا حال ہو گیا جیسا تم دیکھ رہے ہو۔''

(ترمذی: ۱۵۰۵)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے معاملے کو آدمی کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ حسبِ توفیق جتنے جانور چاہے قربان کر سکتا ہے۔ البتہ اس نیک عمل کو اخلاص کے ساتھ اور اجر و ثواب کی امید میں انجام دینا چاہیے۔ فخر و مباہات کے جذبے اور ریا کاری کے شائبے سے بچنا چاہیے۔

۳۔ خصی کیے گئے جانور کی قربانی جائز ہے۔ ناجائز ایسے جانور کی قربانی ہے، جس میں کوئی ایسی تبدیلی قدرتی طور پر یا بعد میں پیدا ہو گئی ہو، جس کا شمار عموماً عیب میں کیا جاتا ہو۔ خصی کیے جانے کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ بل کہ ایسے جانوروں کا گوشت زیادہ عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے، اس میں بدبو نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ سے خصی کیے گئے جانور کی قربانی ثابت ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے دو خصی کیے ہوئے موٹے تازے مینڈھوں کی قربانی کی۔ (ابنِ ماجہ: ۳۱۲۲، احمد، ۵/ ۱۹۶، ۶/ ۸، ۲۲۰، ۲۲۵)

شادی کی رسمیں

سوال: میرے گاؤں میں چند رسوم رائج ہیں جو میرے خیال میں درست نہیں ہیں۔ بہ راہِ کرم قرآن و حدیث اور شریعت کی روشنی میں ان پر مدلل اور مفصل اظہار خیال فرمادیں:

۱۔ شادی کے موقع پر لڑکے والوں کی طرف سے شادی کی تاریخ سے ایک یا دو روز پہلے گاؤں والوں کو گھر گھر کھانا پہنچایا جاتا ہے۔

۲- شادی کے موقع پر لڑکے والے لڑکی والوں سے کھانے کے لیے خاص خاص چیزوں کی فرمائش، بل کہ حکم صادر کرتے ہیں۔

اس طرح کے کھانے کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فقیروں کا کھانا ہے۔ بہ راہِ کرم واضح فرمائیں کہ ان رسوم کا شریعت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اسلام کو آسان، قابلِ عمل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ دین بنایا تھا، لیکن ہم مسلمانوں نے طرح طرح کی غیر شرعی رسوم ایجاد کر کے اسے مشکل اور بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ عمل بنا دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک صفت قرآن میں یہ بیان کی گئی ہے کہ آپؐ نے لوگوں پر سے وہ بوجھ اتار دیے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھول دیں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے: يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ‌ؕ (الاعراف: ۱۵۷) لیکن ہم نے پھر اپنے وہ بوجھ لاد لیے ہیں اور خود کو ان بیڑیوں میں جکڑ لیا ہے۔

مسلم معاشرے کا جائزہ لیں تو وہ سیکڑوں ایسی رسوم میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے، جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ بچے کی پیدائش سے لے کر وفات تک، قدم قدم پر، طرح طرح کی رسمیں انجام دی جاتی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپیہ لٹایا جاتا ہے۔ رقم کا بر وقت انتظام نہ ہو سکے تو ادھر ادھر سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر کوئی رسم چھوٹنے نہیں پاتی۔ ان رسموں میں سے بہت سی شادی بیاہ کے موقع پر انجام دی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔

نکاح کے موقع پر پیش کیے جانے والے خطبے میں قرآنِ کریم کی تین آیتیں پڑھی جاتی ہیں: النساء: ۱، آل عمران: ۱۰۲، الاحزاب: ۷۰۔ اس موقع پر ان آیتوں کے انتخاب میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ ان میں چار مرتبہ اِتَّقُوۡا رَبَّكُمُ (اپنے رب سے ڈرو) یا اِتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) کے الفاظ آئے ہیں۔ شادی کا موقع انتہائی خوشی و مسرت کا ہوتا ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس موقع پر کوئی شخص آپے سے باہر ہو جائے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بتائی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے۔ اس لیے بار بار اللہ سے ڈرنے کی تاکید کی گئی۔ یہ آیتیں ہر نکاح کے موقع پر پڑھی جاتی ہیں، تقریباتِ نکاح میں موجود ہر شخص انھیں سنتا ہے، لیکن کسی کو تنبہ نہیں ہوتا کہ ذاتی خواہشات کی

تکمیل اور رسم ورواج کی پاس داری میں وہ اللہ اور رسول کے کس کس حکم کو پامال کر رہا ہے۔

شادی سے پہلے لڑکے والوں کی طرف سے کھانا تقسیم کرنا، لڑکی والوں سے جہیز کا مطالبہ کرنا، بارات کی شکل میں پوری فوج کو لڑکی والوں کے یہاں لے جانا اور باراتیوں کی خاطر مدارات کے لیے ان سے کھانے کی خاص خاص چیزوں کی فرمائش کرنا، یہ سارے کام شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ولیمے کا حکم دیا ہے، مگر ساتھ ہی ولیمے کی ایسی دعوت کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے، جس میں صرف مال داروں کو بلایا جائے اور غریبوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

مصنوعی استقرار حمل

سوال: ایک صاحب کی شادی تقریباً دس ماہ قبل ہوئی تھی۔ اس عرصے میں حمل کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تو زوجین نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے مختلف طرح کے ٹیسٹ کرانے کے بعد بتایا کہ بچہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ عورت کی بچے دانی کا ٹیوب بند ہے۔ ہاں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا طریقہ اپنا کر استقرار حمل کروایا جاسکتا ہے۔

بہ راہِ کرم واضح فرمائیں، کیا ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے استقرار حمل کروانا اور اس طریقے سے اولاد حاصل کرنا شرعی اعتبار سے جائز ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی افزائش کا جائز طریقہ نکاح کی صورت میں مشروع کیا ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان نکاح کے ذریعے ایک خاص تعلق قائم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اولاد کی خواہش فطری طور پر ہر شادی شدہ جوڑے کو ہوتی ہے۔ (آل عمران: ۱۴) قرآن میں انھیں دنیاوی زندگی کی زینت (الکہف: ۴۶) اور بندوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان (بنی اسرائیل: ۶) قرار دیا گیا ہے۔ انسانوں کی تخلیق کے معاملے میں اس چیز کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی قرار دیا گیا ہے کہ کسی کے یہاں صرف لڑکے پیدا ہوتے ہیں، کسی کے یہاں صرف لڑکیاں، کسی کے یہاں دونوں اور کسی کے یہاں مطلق کوئی اولاد نہیں ہوتی:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ

يَشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝

(الشوریٰ:۴۹، ۵۰)

”اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔“

تولید کا فطری طریقہ یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے تناسلی اعضا سے مادۂ منویہ کا اخراج ہوتا ہے۔ مرد کے مادۂ منویہ میں حیوانات منویہ (Sperms) اور عورت کے مادۂ منویہ میں بیضہ (Ovum) ہوتا ہے۔ دونوں کا اختلاط و اتصال رحم مادر سے متصل ایک ٹیوب میں ہوتا ہے، جسے Fallopian Tube کہتے ہیں۔ اتصال کے بعد وہ مخلوط مادہ رحم میں آجاتا ہے اور وہاں استقرار پاکر جنین کی شکل میں پرورش پانے لگتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (الدہر:۲)

”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے۔“

اس فطری طریقے میں کوئی نقص پیدا ہو جائے یا کہیں کوئی رکاوٹ آجائے تو استقرار حمل نہیں ہو سکتا۔ اسی کو بانجھ پن کہتے ہیں۔ اس کا تعلق مرد سے بھی ہو سکتا ہے، مثلاً وہ مردانہ قوت میں کمی کی وجہ سے مجامعت پر قادر نہ ہو، اس کے مادۂ تولید میں حیوانات منویہ کا تناسب کم اور ان کی حرکت کم زور ہو یا مادۂ تولید کو خصیوں سے عضو تناسل تک لانے والی رگیں مسدود ہو گئی ہوں۔ اور اس کا تعلق عورت سے بھی ہو سکتا ہے، مثلاً اس کے خصیۃ الرحم (Overy) میں کسی نقص کے سبب اس سے بیضہ کا اخراج ممکن نہ ہو، Fallopian Tube کسی وجہ سے بند ہو گیا ہو، یا کسی مرض کے سبب اس کے رحم میں مخلوط نطفہ کا استقرار ممکن نہ ہو۔

بانجھ پن ایک مرض ہے۔ اس کے ازالہ کے لیے علاجی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں،

جس طرح دوسرے امراض کے ازالے کے لیے علاج کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

يَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوُوا فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ دَوَاءً ۔

(ابوداؤد: ۳۸۵۵، ترمذی: ۲۰۳۹، ابن ماجہ: ۳۴۳۶)

فطری طریقے سے استقرارِ حمل ممکن نہ ہوتو اس کے لیے مصنوعی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس عمل کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری (In Vitro Fertilization) کہا جاتا ہے۔ اس طریقے میں عورت کا بیضہ اور مرد کا نطفہ حاصل کرکے دونوں کو ایک ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کیا جاتا ہے، پھر ایک متعین مدت کے بعد اس بارآور بیضہ کو عورت کے رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ اس مصنوعی طریقے میں اگر نطفہ شوہر کا اور بیضہ بیوی کا ہو، دونوں کو کسی ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کرکے بیوی کے رحم میں منتقل کردیا جائے تو شرعی طور پر ایسا کرنا جائز ہے۔

آج کل مغرب میں مصنوعی تولید کے بہت سے طریقے رواج پاگئے ہیں۔ شوہر مکمل نامرد ہو یا اس کا نطفہ تولید کی صلاحیت سے محروم ہو تو عورت کو بارآور کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کا نطفہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مادۂ تولید کے بڑے بڑے مراکز (Sperm Banks) قائم ہوگئے ہیں۔ بیوی کے خصیۃ الرحم سے بیضہ کا اخراج نہ ہوتا ہو تو دوسری عورت سے بیضہ حاصل کرلیا جاتا ہے۔ شوہر کا نطفہ ٹھیک ہو اور بیوی سے بیضہ کا اخراج ہوتا ہو، لیکن وہ رحم کے کسی مرض کی وجہ سے حاملہ نہ ہوسکتی ہو تو کسی دوسری عورت کا رحم کرایے پر لیا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کی رو سے یہ تمام طریقے ناجائز ہیں۔ اس لیے کہ ان سے اختلاطِ نسب ہوتا ہے اور نکاح کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اسلام نے نسب کی حفاظت کی تاکید کی ہے اور ان تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے، جن سے کسی شخص کا نسب مشتبہ ہوجائے۔

ناقص الخلقت جنین کا اسقاط

سوال: ایسا ناقص الخلقت جنین، جس کے بارے میں الٹراساؤنڈ سے یقین ہوگیا ہو کہ وہ پیدا ہوگا تو مختصر عرصے میں مرجائے گا یا زندہ رہے گا تو معمول کی زندگی نہیں گزار سکے گا۔ کیا اس کا اسقاط کرانا جائز ہے؟

بہ راہِ کرم اس مسئلے میں شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: اسلامی شریعت نے جنین کو وہی حیثیت دی ہے جو زندہ انسان کی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس نے ان تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، جن سے جنین کو ضرر لاحق ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر جنین کو کسی قسم کا خطرہ ہو تو حاملہ یا مرضعہ (دودھ پلانے والی) عورت کو رمضان کے روزے نہ رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح اس پر حد جاری نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ وہ بچے کو جنم نہ دے لے اور وہ دودھ چھڑانے کی عمر کو نہ پہنچ جائے۔

اسی بنا پر علما نے روح پھونکے جانے کی مدت کے بعد اسقاط کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ مدت بخاری و مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ایک سو بیس دن ہے۔ اس سے قبل اس کے جواز یا عدم جواز کے سلسلے میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض علما کے نزدیک بہ وقتِ ضرورت جائز ہے۔ کیوں کہ روح پھونکے جانے سے قبل جنین محض ایک بے جان لوتھڑا ہے، لیکن بعض علما اس وقت بھی اسقاط کو حرام نہیں تو مکروہ ضرور قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو آئندہ اس میں روح پڑ جائے گی۔

بعض علما کے نزدیک روح پھونکے جانے کی مدت کے بعد بھی ناگزیر حالت میں اسقاط کروایا جاسکتا ہے۔ یہ ناگزیر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جنین میں کوئی ایسا تخلیقی نقص پیدا ہوجائے کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی زندگی اجیرن ہوجائے۔ الٹرا ساؤنڈ سے ایسے نقائص کا پتا لگ جاتا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے ایک سوال کے جواب میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور ان علما کی رائے سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے بعض دلائل دیے ہیں، آخر میں لکھا ہے:

''میری نظر میں صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں اسقاط کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ اسقاط نہ کرایا گیا تو ماں کی جان کو خطرہ لاحق ہوجائے۔ ایسی صورت میں ماں کی جان بچانے کے لیے حمل کو ساقط کرایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ماں کی جان بہ ہر حال بچے کی جان سے زیادہ اہم ہے۔'' (فتاویٰ یوسف القرضاوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، جلد: دوم، ص: ۲۲۵)

ازدواجی تعلقات اور حقوق

سوال: زید کی شادی ۲۷، ۲۸ سال پہلے ہوئی تھی۔ زوجین نے پر مسرت ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے درمیان کسی طرح کی ناچاقی یا ناخوش گواری نہیں تھی۔ اس عرصے میں ان کی پانچ اولادیں ہوئیں، جو بحمد اللہ اب جوان ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹی کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ زید کی بیوی نے گزشتہ دس سال سے اس کے کمرے میں سونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے جوان بچوں کے ساتھ الگ کمرے میں سوتی ہے اور شوہر دوسرے کمرے میں اکیلا سوتا ہے۔ زید اسے بار بار اللہ اور رسولؐ کا واسطہ دے کر اس کا فرض منصبی یاد دلاتا ہے اور اسے اپنے کمرے میں سلانا چاہتا ہے۔ مگر وہ کہہ دیتی ہے کہ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں، وہ کیا سوچیں گے؟ پھر انھیں اکیلے الگ کمرے میں رکھنا مناسب نہیں، ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ زید عمر کے اس مرحلے میں پہنچ چکا ہے، جہاں وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی زیادہ اوقات اس کے ساتھ رہے۔ شادی صرف جنسی تعلق قائم کرنے کے لیے تو نہیں کی جاتی۔ اس کی بیوی بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے، لیکن عملاً وہ شوہر کے حقوق ادا کرنے سے غفلت برتتی اور جوان اولاد کی دیکھ بھال کو ترجیح دیتی ہے۔ اب وہ صرف اپنے بچوں کی ماں بن کر رہ گئی ہے۔ اس صورت حال میں درج ذیل امور جواب طلب ہیں:

۱- کیا زید اور اس کی بیوی کے درمیان زن و شوہر کی حیثیت باقی ہے؟ یا ختم ہو گئی ہے؟

۲- بیوی کا رویہ کہیں شوہر سے خلع حاصل کرنے کے زمرے میں تو نہیں آتا؟

۳- کیا دونوں ایک مکان میں رہ سکتے ہیں اور بلا کراہت ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ ازدواجی تعلقات کا مطلب ہی یہ ہے کہ عام حالات میں بیوی ہمیشہ رات اپنے شوہر کے ساتھ گزارے۔ الّا یہ کہ کوئی شرعی مجبوری آڑے آ گئی ہو۔

جواب: مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں، لیکن نکاح کے دو بول کہتے ہی ان کے درمیان انتہائی قریبی تعلق استوار ہو جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے:

لَمْ نَرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلَ النِّكَاحِ۔ (ابن ماجہ: ۱۸۴۷)

''نکاح کے ذریعے زوجین میں جیسی محبت پیدا ہو جاتی ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ دو افراد کے درمیان ویسی محبت کسی اور ذریعے سے پیدا ہوتی ہو۔''

ازدواجی زندگی کا ثمرہ جب بچے کی ولادت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو عورت کی توجہ بٹ جاتی ہے۔ اس کی محبت کا ایک اور حق دار وجود میں آجاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی تمام تر محبتیں اپنے شوہر پر نچھاور کرتی تھی اور اس کے تمام اوقات اور پوری توجہات اپنے شوہر کے لیے وقف تھیں، اب اس کا بچہ بھی اس کی نگاہِ التفات کو اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے اور اس کا خاصا وقت اس کی پرورش و پرداخت میں صرف ہونے لگتا ہے۔ بچہ اور بڑا ہوتا ہے تو ماں باپ دونوں مل کر اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر دھیان دیتے ہیں اور زندگی کی دوڑ میں شریک ہونے کے لیے اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ بچوں کی عمر کے کس مرحلے میں ان کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جائے؟ قرآن و حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو انھیں الگ سلایا جائے (مسند احمد، ۲/۱۸۰) اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بستر ماں باپ کے بستر سے بھی الگ ہونے چاہییں۔ سورۂ نور میں، جہاں حجاب سے متعلق مختلف احکام دیے گئے ہیں، وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قریب البلوغ بچوں کو مخصوص اوقات میں ماں باپ کے کمروں میں بغیر اجازت لیے نہیں داخل ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ (النور: ۵۸)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، لازم ہے کہ تمھارے لونڈی غلام اور تمھارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں، تین اوقات میں اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں، صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمھارے لیے پردے کے وقت ہیں۔''

آگے بالغ بچوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ (النور:۵۹)

''اور جب تمھارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ اسی طرح اجازت لے کر آیا کریں جس طرح ان کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے جب بڑے ہوجائیں تو پردے کے احکام ان سے بھی اسی طرح متعلق ہوجاتے ہیں جس طرح بڑوں سے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسی آیات اور احادیث ہیں، جن سے زوجین کے ایک کمرے میں رات گزارنے کا اشارہ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ

(النساء:۳۴)

''اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علاحدہ رہو۔''

'مضاجع' کا ترجمہ بستر بھی کیا گیا ہے اور خواب گاہ بھی۔ اس کی تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے:

وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ (ابوداؤد:۲۱۴۲)

''اور (بیوی سے) مت علیحدگی اختیار کرو، مگر خواب گاہ میں۔''

بیوی کی سرکشی اور نافرمانی کی صورت میں اس کی تادیب و اصلاح کے لیے بستر میں، یا خواب گاہ میں اس سے علاحدہ رہنے کو کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں زوجین کا ساتھ رہنا پسندیدہ اور مطلوب ہے۔

اوپر کے خط میں سائل نے بیوی کے جس رویّے کی شکایت کی ہے، اس کا تعلق نام نہاد مشرقی تہذیب سے ہے۔ عموماً جب بچے کچھ بڑے اور باشعور ہوجاتے ہیں تو عورتیں ان کی

موجودگی میں اپنے شوہروں کے کمروں میں رہنے سے شرماتی اور اسے ناپسند کرتی ہیں۔ اس کے بہ جائے بچوں کی ایسی دینی اور اخلاقی تربیت کرنی چاہیے کہ وہ اس عمل کو اجنبی اور غیر اخلاقی نہ سمجھیں۔ ویسے بھی ازدواجی تعلق صرف جنسی عمل کا نام نہیں ہے۔ بہت سے معاملات و مسائل روزمرہ کی زندگی میں ایسے ہوتے ہیں، جن پر بچوں کی غیر موجودگی میں زوجین کا تنہائی میں گفتگو کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ بیوی کے فرائض میں سے ہے کہ وہ شوہر کو گھر میں سکون فراہم کرے اور جائز امور میں اس کی نافرمانی نہ کرے۔ اللہ کے رسولؐ سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے اچھی عورت کون ہے؟ فرمایا:

اَلَّتِیْ تَسُرُّہٗ اِذَا نَظَرَ وَ تُطِیْعُہٗ اِذَا اَمَرَ وَلاَ تُخَالِفُہٗ فِیْ نَفْسِھَا وَلاَ مَالِھَا بِمَا یَکْرَہُ۔ (سنن النسائی: ۳۲۳۱، مسند احمد، ۲/ ۲۵۱)

''وہ عورت جس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو جائے، وہ اسے کسی چیز کا حکم دے تو اس پر عمل کرے اور اپنی ذات کے بارے میں اور اس مال کے بارے میں جو اس کی تحویل میں ہے، شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔''

اس معاملے میں زوجین کو افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔ نہ انھیں اپنے باشعور بچوں کے سامنے کھلے عام ایسی 'حرکتیں' کرنی چاہییں، جن کا شمار بے حیائی میں ہوتا ہو اور نہ ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جانا چاہیے کہ دوسرا فریق اسے اپنی حق تلفی شمار کرنے لگے۔ رہیں وہ باتیں، جن کا تذکرہ خط کے آخر میں کیا گیا ہے، وہ جاہلانہ باتیں ہیں۔ بیوی کے کچھ عرصہ شوہر سے الگ دوسرے کمرے میں رہنے سے نہ تو ازدواجی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، نہ یہ عمل خلع حاصل کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے چاہییں اور ان کی ادائی کے لیے شرحِ صدر کے ساتھ خود کو آمادہ کرنا چاہیے۔

بگڑے ہوئے شوہر کی اصلاح کا صحیح طریقہ

سوال: میری شادی ایک جانے پہچانے خاندان میں ہوئی ہے۔ میری والدہ اور ساس بہت قریبی سہیلیاں تھیں۔ پچیس سال سے ان کے درمیان تعلقات تھے۔ میرے والد کا انتقال

میرے بچپن میں ہوگیا تھا۔ میرے بھائی نے میری کفالت اور تعلیم و تربیت کی، پھر میری شادی کے تمام مصارف برداشت کیے۔ شادی سے قبل میرے شوہر نے مجھے دیکھ کر اپنی رضامندی دی تھی۔ شادی کے بعد کچھ عرصے تک میری سسرال والوں کے تعلقات میرے میکے والوں سے ٹھیک رہے۔ لیکن پھر میرے شوہر میرے میکے والوں سے چڑنے لگے۔ وہ اپنی بہن اور بہنوئی سے تو خوب ربط ضبط رکھتے ہیں، لیکن میرے بھائی، والدہ اور دوسرے رشتے داروں سے نہ خود کبھی ملتے ہیں نہ فون پر ہی ان کی خیریت لیتے ہیں۔ بل کہ ان کا مجھ سے ملنے کے لیے آنا بھی پسند نہیں کرتے۔ البتہ میرے ساتھ ان کا رویہ اچھا رہتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے شادی کی سال گرہ پر مجھے لیپ ٹاپ کا تحفہ دیا۔ وہ جو کچھ کماتے ہیں میرے حوالے کر دیتے ہیں اور مجھے پوری آزادی ہوتی ہے کہ اس میں سے جو چاہوں خرچ کروں۔

میں اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر میں رہتی ہوں۔ جب میں وطن جاتی ہوں تو سسرال کے تمام رشتے داروں کے لیے تحائف لے کر جاتی ہوں، لیکن میرے شوہر میرے میکے والوں کے لیے کوئی تحفہ دیں، یہ تو دور کی بات ہے، پوچھتے تک نہیں کہ میں ان کے لیے کچھ لے کر جارہی ہوں یا نہیں۔

میں پہلی مرتبہ امید سے ہوئی تو میرے شوہر نے دباؤ ڈالا کہ میں اسقاط کروالوں۔ میں تیار نہیں ہوئی۔ وضع حمل کے دن قریب آئے تو میں اپنے میکے چلی گئی۔ وہیں ایک بچی کی ولادت ہوئی۔ یہ خبر سن کر میرے بھائی، جو دوسری جگہ سروس کرتے ہیں، وہ تو فوراً گھر پہنچ گئے، لیکن میرے شوہر ایک مہینے کے بعد آئے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچی کی ولادت سے خوش نہیں ہوئے۔

میرے شوہر کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ جب میرے ساتھ باہر نکلتے ہیں تو دوسری عورتوں کو یا پوسٹروں اور ہارڈنگس میں ان کے فوٹو دیکھ کر مختلف تبصرے کرتے رہتے ہیں۔ میری بھنویں موٹی ہیں اور ہاتھوں اور پیروں میں بال ہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ انھیں یہ پسند نہیں ہے۔ کیا میں اپنی بھنویں پتلی کرا سکتی ہوں؟ اور ہاتھوں پیروں میں Waxing کر سکتی ہوں؟

اپنے شوہر کے بارے میں جب سے مجھ پر ایک معاملے کا انکشاف ہوا ہے، میرا سارا سکون غارت ہوگیا ہے اور میں شدید ذہنی الجھن کا شکار ہوگئی ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے ڈپریشن کا

مرض لاحق ہوگیا ہے۔ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ میرے شوہر کے لیپ ٹاپ میں کیا کیا ہے؟ انھوں نے Password لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے دریافت کیا، لیکن انھوں نے نہیں دیا۔ میں کوشش کرتی رہی، یہاں تک کہ میں نے اسے جان لیا۔ لیپ ٹاپ کھولا تو میں چکرا کر رہ گئی۔ انھوں نے انتہائی فحش فلمیں اور گندے گانے لوڈ کر رکھے تھے۔ میرے اللہ! میرے شوہر اتنے برے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے ان سے خوب جھگڑا کیا۔ بالآخر انھوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ان گندے کاموں سے بچیں گے۔ میں نے ان پر اعتبار کرلیا، لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے پھر انھیں گندی تصویریں دیکھتے اور فحش گانے سنتے ہوئے پکڑ لیا۔ پھر تو میں بہت روئی اور انھیں بھی خوب سخت سست کہا۔ انھوں نے پھر وعدہ کیا کہ اب وہ خود کو سدھار لیں گے۔ اس صورت حال سے مجھے شدید کوفت ہونے لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ اپنے شوہر کی برائی میں کسی سے کر بھی نہیں سکتی تھی۔ صرف اپنی بہن اور بھائی سے اپنی الجھن بیان کی، لیکن ان سے بھی مجھے کچھ رہ نمائی نہیں مل سکی۔

اب میرے شوہر میں ایک دوسری برائی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ وہ گھر میں ہر وقت ٹی وی آن رکھتے ہیں۔ شام کو آفس سے آتے ہی ٹی وی چلا دیتے ہیں، جو سوتے وقت تک برابر چلتا رہتا ہے، بل کہ بسا اوقات سو جاتے ہیں اور ٹی وی چلتا رہتا ہے۔ اس پر آنے والے پروگرام بہت زیادہ فحش اور عریاں تو نہیں ہوتے، لیکن انھیں اچھا پروگرام بھی نہیں کہا جا سکتا۔ میں انھیں منع کرتی ہوں تو وہ مانتے نہیں۔ جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہوں تو کہتے ہیں کہ ٹی وی کو پیک کر دیں گے یا بیچ دیں گے۔

کچھ دنوں قبل میں نے اپنا ایک فوٹو Facebook پر ڈال دیا۔ اسے صرف میرے قریبی رشتے دار یا کالج کے زمانے کے دوست واحباب دیکھ سکتے تھے، لیکن میرے شوہر کو معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور میرے کردار پر شبہ کرنے لگے۔ میں نے صفائی دی اور بات نہ بڑھے، اس لیے ان سے معافی مانگ لی۔

میرے شوہر پنج وقتہ نمازوں سے غافل ہیں۔ وہ صرف جمعے کی نماز پڑھتے ہیں۔ میں کبھی ان سے نماز پڑھنے کے لیے کہتی ہوں تو جواب دیتے ہیں کہ تم پڑھ لو، میں بعد میں پڑھ لوں گا۔

میں الحمد للہ! نمازوں کی پابندی کرتی ہوں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار کا اہتمام کرتی ہوں۔ رات میں اٹھ کر تہجد بھی پڑھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں بھی کرتی ہوں کہ میرے شوہر کی عادتیں سدھار دے اور انھیں سچا پکا مسلمان بنا دے۔ لیکن میری دعائیں قبول ہوتی ہوئی نظر نہیں آرہی ہیں۔

میں نے دل پر جبر کر کے اپنے اور اپنے شوہر کے بارے میں تفصیل سے اتنی باتیں آپ سے اس لیے لکھ دی ہیں، تا کہ آپ ان کی روشنی میں مناسب رہ نمائی فرمائیں کہ ان حالات میں میں کیا کروں؟ مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میری ازدواجی زندگی برباد ہو کر نہ رہ جائے۔ بہ راہِ کرم اپنے مشوروں سے نوازیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جواب: آپ کا مفصل خط پڑھا۔ جو کچھ آپ نے تحریر کیا ہے اس کی روشنی میں کچھ مشورے درج کر رہا ہوں۔ جذباتی ہونے کے بہ جائے ان باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کیجیے۔ ان شاء اللہ آپ کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور آپ کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہو جائے گی۔

۱- آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کا رویہ آپ کے ساتھ اچھا رہتا ہے۔ انھوں نے سال گرہ پر آپ کو لیپ ٹاپ کا تحفہ دیا۔ آپ پر ان کے اعتماد کا مظہر یہ ہے کہ اپنی کمائی وہ آپ کے حوالے کر دیتے ہیں اور آپ اپنی مرضی سے اسے خرچ کرتی ہیں۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور آئندہ بھی آپ کو ساتھ رکھنے میں انھیں کوئی تردد نہیں ہے۔ محبت کا جواب محبت سے دینا چاہیے۔ حدیث میں زوجین کے درمیان محبت کو بے مثال قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

'دو محبت کرنے والوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ نکاح سے بڑھ کر اور کوئی نہیں۔'

(ابن ماجہ: ۱۸۴۷)

۲- آپ کے والد صاحب کے انتقال کے بعد بڑے بھائی نے آپ کی سرپرستی کی۔ اس بنا پر آپ کی ان سے شدید محبت فطری ہے۔ لیکن آپ کے شوہر بھی ان کو اتنا ہی چاہیں

جتنا آپ چاہتی ہیں، یہ ناممکن بھی ہے اور غیر فطری بھی۔ آپ کا احساس ہے کہ آپ کے شوہر اپنی بہن اور بہنوئی وغیرہ سے گھل مل کر رہتے ہیں، مگر آپ کے میکے والوں سے زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتے، یہ چیز تو فطری ہے۔ اس پر آپ کی شکایت مناسب نہیں ہے۔

۳- سسرالی رشتے داروں سے اچھے تعلقات رکھنا شوہر اور بیوی دونوں کی ذمے داری ہے۔ قرآن کریم میں نسبی اور سسرالی دونوں رشتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ (الفرقان: ۵۴) حدیث میں بھی سسرالی رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (مسلم: ۲۶۴۳، احمد: ۵/۱۷۴) اگر آپ کے شوہر اپنی یہ ذمے داری نہیں نبھاتے تو وہ قصوروار ہیں۔ آپ اپنے سسرالی رشتے داروں کا خیال رکھتی ہیں تو بہت اچھا کرتی ہیں۔ اپنے وطن جائیں تو اپنے حقیقی اور سسرالی دونوں طرح کے رشتے داروں کے لیے تحائف لے کر جائیں۔ وطن سے دور اپنے شوہر کے ساتھ رہیں تو حقیقی اور سسرالی دونوں طرح کے رشتہ داروں کی فون کے ذریعے خیریت لیتی رہیں۔ اگر آپ کے شوہر آپ کے خونی رشتے داروں کے ساتھ احترام سے نہیں پیش آتے، ان کی خیریت نہیں معلوم کرتے تو بدلے میں آپ ان کے خونی رشتے داروں سے اعراض نہ کیجیے۔

۴- شادی کے بعد اولاد ہونا اللہ کی طرف سے میاں بیوی کے لیے تحفہ ہوتا ہے۔ اولاد کی رغبت اور خواہش فطری طور پر ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کا حکم دیا گیا ہے۔ (البقرۃ: ۲۲۳) لیکن کوئی جوڑا اگر اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے بچے کی پیدائش کو کچھ دنوں کے لیے مؤخر کرنا چاہے تو اس کے لیے تدابیر اختیار کرسکتا ہے۔ البتہ مانع حمل تدابیر اختیار کرنا زیادہ موزوں ہے اس کے مقابلے میں کہ حمل ٹھہر جائے، پھر اس کا اسقاط کروایا جائے۔ اس سلسلے میں زوجین باہمی رضامندی سے کوئی تدبیر اختیار کرسکتے ہیں۔

۵- آپ کی ڈیلیوری آپ کے میکے میں ہوئی، اس لیے آپ کے بھائی کو تو موقع پر پہنچنا ہی

چاہیے تھا۔ یہ ان کا فرض تھا، لیکن شوہر اگر کسی وجہ سے تاخیر سے پہنچے تو یہ چیز بھی باعث شکایت نہیں ہے۔ آپ کی شکایت اس وقت بجا ہوتی جب آپ اپنی سسرال میں ہوتیں، اس کے باوجود شوہر آپ کی خبر گیری میں کوتاہی کرتے۔

۶- ہر باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس کا اظہار الفاظ سے اور عمل سے کرتے ہیں اور کچھ لوگ سنجیدہ ہوتے ہیں، جو کھل کر اظہار نہیں کرتے۔ اس لیے یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ کے شوہر کو بچی سے اتنی محبت نہیں ہے، جتنی ہونی چاہیے۔

۷- آپ کا مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ آپ کی بھنویں موٹی ہیں یا ہاتھوں پیروں میں زیادہ بال ہیں، اس لیے اگر آپ بھنویں پتلی کر لیں یا ہاتھوں پیروں میں Waxing کر لیں تو آپ کے شوہر آپ کو زیادہ چاہنے لگیں گے۔ آپ کے بیان کے مطابق انھوں نے آپ کو دیکھ کر شادی کی ہے۔ اگر آپ کی جسمانی ہیئت انھیں ناپسند ہوتی تو وہ شادی پر آمادہ ہی کیوں ہوتے۔ حدیث میں بھنویں پتلی کرنے سے صاف الفاظ میں منع کیا گیا ہے، اس لیے آپ خود یہ اقدام نہ کریں۔ لیکن اگر آپ کے شوہر صاف لفظوں میں آپ سے ایسا کرنے کی خواہش اور اصرار کریں تو آپ ایسا کر سکتی ہیں۔

۸- آپ کی الجھن اور ڈپریشن کا اصل سبب یہ ہے کہ آپ کے بیان کے مطابق آپ کے شوہر فحش فلمیں دیکھتے اور گندے گانے سنتے ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں ان چیزوں سے بچنا چاہیے اور اگر شیطان کے بہکاوے میں آ کر وہ ان چیزوں میں مبتلا ہو گئے ہیں تو ایک نیک بیوی کی حیثیت سے آپ کو انھیں ان کاموں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن ان کی اصلاح کا مناسب طریقہ وہ نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا ہے۔ وہ جب تک گھر میں رہیں انھیں اتنی اپنائیت دیجیے کہ انھیں دوسری خرافات میں پڑنے کی خواہش ہی نہ ہو۔ ان کے سامنے شائستہ طریقے سے ان کاموں کی خباثت واضح کیجیے۔ انھیں بتائیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان چیزوں سے سختی سے روکا ہے اور یہ کہ دوسرے انسانوں کی نظروں سے کتنا ہی چھپا کر ان کاموں کو کیا جائے، مگر اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی باتیں ضرور اپنا اثر دکھائیں گی اور ان کی اصلاح ہو جائے گی۔

۹- آپ نے کئی کام غلط کیے ہیں، جنھیں آپ کو ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب عہد کیجیے کہ آئندہ ان سے بچیں گی۔ پہلا کام یہ کہ آپ نے اپنے شوہر کی جاسوسی کی، یہ جاننے کی کوشش کی کہ انھوں نے اپنے لیپ ٹاپ میں کیا کیا چھپا رکھا ہے؟ ان سے Password پوچھا۔ انھوں نے نہیں بتایا تو بھی آپ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں اور بالآخر اسے جان ہی لیا۔ اس طرح ان کی مرضی کے خلاف کام کیا اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ زوجین کے درمیان قریبی تعلق کی بنیاد باہمی اعتماد ہے۔ اگر کسی ایک کا دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جائے تو یہ تعلق دیر پا نہیں رہ سکتا اور خوش گواری باقی نہیں رہ سکتی۔ دوسرا غلط کام یہ کیا کہ اپنے شوہر کی خامیاں اور کم زوریاں اپنی بہن اور بھائی کو بتائیں، حالاں کہ نہ آپ کے بھائی نے آپ سے اپنی بیوی کی کم زوریوں کا تذکرہ کیا، نہ آپ کی بہن نے آپ سے اپنے شوہر کی کم زوریاں بتائیں۔ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ (البقرۃ: ۱۸۷) لباس زینت کا ذریعہ ہے اور جسم کے عیب کو بھی چھپاتا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کے عیوب کسی اور پر ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے سامنے ہمیشہ اپنے شوہر کی صرف خوبیاں ہی بیان کیجیے، ان کی کوئی خامی ہرگز زبان پر نہ لائیے۔ واقعتہً کوئی کم زوری ہو تو اسے آپس میں محدود رکھ کر حل کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ نے تیسرا غلط کام یہ کیا کہ اپنا فوٹو فیس بک پر ڈالا اور اپنے شوہر کو نہیں بتایا۔ کوئی کام شوہر کو اندھیرے میں رکھ کر نہ کیجیے اور کوئی کام ایسا نہ کیجیے جس سے شوہر آپ پر شک کرنے لگ جائے۔ ان کا ڈانٹنا درست تھا اور آپ نے اپنی غلطی مان لی، یہ اچھا کیا۔

۱۰- ہر مرد اور عورت اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس پر لازم ہے کہ دین کے تقاضوں پر عمل کرے اور برے کاموں سے حتی الامکان اپنے کو بچائے۔ کوئی دوسرا شخص خواہ اس کا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو، اس کے گناہوں کا اس پر کچھ وبال نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا زندگی بھر کافر رہا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کی موت حالتِ کفر میں ہوئی۔ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کو

ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوئی تو اس کا وبال ان پیغمبروں پر نہیں آیا۔ مصر کا بادشاہ فرعون بڑا ظالم وجابر اور اللہ کا نافرمان تھا۔ اس کی بیوی آسیہ کو ایمان کی توفیق ملی تو فرعون کے کفر نے ان کا کچھ نہ بگاڑا۔ آپ اپنی ذاتی حیثیت میں اگر دین کے تقاضوں پر عمل کر رہی ہیں تو مطمئن رہیے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہوگا اور آخرت میں اس کا اچھا بدلہ عطا کرے گا۔

۱۱۔ شوہر اور بیوی کا ایک دوسرے سے بڑا قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ دونوں کی ذمے داری ہے کہ نہ صرف دنیوی معاملات میں ایک دوسرے کا بھلا سوچیں، بل کہ دین پر چلنے کے معاملے میں بھی ایک دوسرے کی مدد کریں۔ کسی سے کوتاہی ہو تو دوسرا محبت اور دل سوزی کے ساتھ اسے سمجھائے۔ ایک حدیث میں بڑے اچھے انداز میں یہی بات کہی گئی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: 'اللہ اس مرد پر رحم کرے جو رات میں اٹھے اور اپنی بیوی کو بھی اٹھائے اور دونوں نماز پڑھیں اور اللہ اس عورت پر رحم کرے جو رات میں اٹھے اور اپنے شوہر کو اٹھائے اور دونوں مل کر نماز پڑھیں'۔ (ابو داؤد: ۱۳۰۸) آپ اپنے شوہر کو دین کے راستے پر چلانا چاہتی ہیں، یہ بڑی اچھی کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو اس کا اجر عطا کرے گا۔

۱۲۔ کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ شوہر ہو یا کوئی اور، دین کی دعوت دینے، اچھے کاموں کی طرف مائل کرنے اور برے کاموں سے روکنے میں حکمت کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ'' (النحل: ۱۲۵) حکمت یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو اس وقت نہ ٹوکا جائے جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہو۔ کیوں کہ اس صورت میں اس کا زیادہ امکان رہتا ہے کہ وہ اس برائی پر جم جائے اور اس کے اندر ضد پیدا ہو جائے۔ اس کی بہ جائے کسی مناسب وقت اسے سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۳۔ بری عادتیں آسانی سے نہیں چھوٹتیں اور نشے کی لت لگ جائے تو اس سے چھٹکارا دشوار ہوتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سگریٹ، گٹکا اور شراب وغیرہ سے صحت کو نقصان ہوتا

ہے، لیکن اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے عادی ہوتے ہیں۔ ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ پر غیر شائستہ پروگراموں کو دیکھنے کی بھی بعض لوگوں کو لت ہوتی ہے، جو شراب نوشی کی طرح چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ اس میں مبتلا لوگ قابل رحم ہوتے ہیں۔ حکمت کے ساتھ اپنے شوہر کی بری عادتوں کو سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ٹی وی/کمپیوٹر وغیرہ پر دیکھنے کے لیے بہت سے اچھے چینل/پروگرام موجود ہیں۔ قرأت، نعت، دینی پروگراموں کی آڈیو/ویڈیو سی ڈیز وغیرہ بھی پائی جاتی ہیں۔ ان پروگراموں کو انٹرنیٹ سے بھی فری ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ ہوسکے تو ان چیزوں میں اپنے شوہر کو مصروف رکھنے کی کوشش کیجیے۔ بری عادتوں میں پڑنے کی وجہ سے ہی آدمی اچھے کاموں سے دور ہوجاتا ہے۔ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے، ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا جائے، انھیں اپنے یہاں مدعو کیا جائے، ان کے یہاں جایا جائے تو بھی اچھے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔

۱۴- آپ اپنے شوہر کی اصلاح میں کام یاب ہوسکتی ہیں۔ ذرا سوچیے: جب آپ نے ان سے نماز پڑھنے کے لیے کہا تو انھوں نے کہا: تم پڑھ لو، میں بعد میں پڑھ لوں گا۔ وہ غصے میں یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں نہیں پڑھوں گا اور آپ ان کا کچھ نہ بگاڑ پاتیں۔ آپ نے انھیں ٹی وی دیکھنے سے روکا تو انھوں نے کہا کہ ہم اسے پیک کردیں گے یا بیچ دیں گے۔ وہ غصے میں یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں ضرور دیکھوں گا۔

۱۵- ایک اہم بات یہ کہ ازدواجی زندگی میں خوش گواری اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے، جب آپ شوہر کو فائنل اتھارٹی کی حیثیت دیں اور گھر کے معاملات میں ان کی رعایت کریں۔ وہ بہک رہے ہوں تو انھیں سنبھالیے، کوئی غلط کام کر رہے ہوں تو انھیں صحیح مشورہ دیجیے، لیکن گھر کا نظام شوہر کی مرضی سے چلنا چاہیے۔ آپ اپنی مرضی سے چلانے کی کوشش کریں گی یا اپنے آپ کو ان سے بالاتر دکھائیں گی تو گھر کا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور آپ اپنا ذہنی سکون کھودیں گی۔ قرآن وحدیث میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ نے شوہر کو گھر کا منتظم بنایا ہے۔ جس طرح آفس میں ایک 'باس' ہوتا ہے،

جس کا کہنا تمام لوگ مانتے ہیں، اسی طرح گھر کا باس شوہر ہے۔ گھر میں اسی کی چلنی چاہیے۔ البتہ شوہر کو تمام معاملات میں بیوی سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے اور باہم رضامندی سے تمام فیصلے ہونے چاہییں۔

۱۶- آخری، لیکن حقیقت میں پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنے لیے، اپنے شوہر کے لیے اور اپنے خاندان کے لیے اللہ تعالیٰ سے خوب دعا کیجیے، وہ سننے والا ہے۔ ان شاء اللہ آپ کے حالات ضرور سدھریں گے اور آپ کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہو جائے گی۔

نومولود کے کان میں اذان دینا

سوال: ہمارے یہاں بعض علماء کہتے ہیں کہ بچے کی ولادت کے بعد سب سے پہلے اس کے کان میں اذان دینی چاہیے۔ یہ حضرات اسے سنت بتاتے ہیں۔ بہ راہ کرم اس کی مشروعیت کے بارے میں بتایئے۔ کیا اس سلسلے میں کوئی حدیث مروی ہے؟

جواب: اذان کی مشروعیت اصلاً نماز کا وقت ہو جانے کا اعلان کرنے کے لیے ہے۔ لیکن بعض دیگر مواقع کے لیے بھی اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس معاملے میں شوافع کے یہاں زیادہ توسع ہے۔ انھوں نے نومولود کے کان میں اذان دینے کو مسنون عمل قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ بعض مواقع پر (مثلاً آتش زدگی کے وقت، راستہ بھٹک جانے کی صورت میں یا مرگی زدہ شخص کے پاس) اذان دینے کو جائز کہتے ہیں۔ مالکیہ اس عمل کو مکروہ اور بدعت قرار دیتے ہیں۔ حنابلہ اور احناف کا معاملہ بین بین کا ہے۔ وہ اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

اس موضوع پر ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس کے یہاں کسی بچے کی ولادت ہو اور اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے اسے ام الصبیان (بچوں کی مرگی) کا مرض نہیں ہوگا۔'' اسے ابویعلی نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے، لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔

(تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، مکتبہ اشرفیہ دیوبند ۵/۸۹، فیض القدیر، مناوی ۶/۲۳۸)

البتہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا عمل ثابت ہے۔ آپؐ کے آزاد کردہ غلام ابو رافع

بیان کرتے ہیں: ''میں نے دیکھا ہے کہ جب حسنؓ کی ولادت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے کان میں اذان کہی'' (ترمذی: ۱۵۱۴) امام ترمذی نے اس کی روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ موجودہ دور کے مشہور محدّث علامہ محمد ناصر الدین البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ نومولود کے کان میں اذان دینے کا عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ لیکن اصطلاحی معنی میں اسے سنت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ عہد نبوی میں بہت سے بچوں کی ولادت ہوئی، لیکن مذکورہ واقعہ کے علاوہ اور کسی موقع پر آپؐ کے اذان دینے کا تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا۔ صحابہ کرام سے بھی یہ عمل ثابت نہیں ہے۔ البتہ اسے مکروہ اور بدعت کہنا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

کیا عقیقے میں بال مونڈنا ضروری ہے؟

سوال: میں نے اپنے پوتے کے عقیقے کی تاریخ طے کردی اور رشتہ داروں کو اس کی اطلاع دے دی۔ تاریخِ عقیقہ سے کچھ دنوں قبل بچے کے سر میں دانے نکل آئے۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے سر کے بال منڈوانے سے منع کیا۔ کیا سر کے بال منڈوائے بغیر بچے کا عقیقہ ہو جائے گا؟ کیا میرے لیے کفایت کرے گا کہ میں اس کے بالوں کا اندازہ کر کے اس کے ہم وزن چاندی کی مالیت کی رقم خیرات کردوں؟

جواب: نومولود کی طرف سے جانور ذبح کرنے کو عقیقہ کہا جاتا ہے۔ حدیث کے مطابق عقیقہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن، اگر اس دن نہ ہو سکے تو چودھویں دن اور اس دن بھی نہ ہو سکے تو اکیسویں دن کرنا چاہیے۔ (بیہقی) اگر اس دن بھی نہ ہو سکے تو بعد میں جب بھی توفیق ہو، عقیقہ کیا جاسکتا ہے۔ فقہاء نے عقیقے کو مسنون قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کا عقیقہ کروایا تھا (ابوداؤد: ۲۸۴۱، نسائی: ۴۲۱۳، ۴۲۱۹) لیکن یہ کوئی تاکیدی حکم نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی روایت میں مذکور نہیں کہ آپؐ نے اپنے صاحب زادے ابراہیم کا عقیقہ کیا ہو۔

عقیقے میں جانور ذبح کرنے کے ساتھ بچے کے بال منڈانے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ، فَاهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا وَ أَمِيطُوا عَنْهُ الأذىٰ۔

(بخاری: ۵۴۷۲)

''بچے کا عقیقہ کرنا چاہیے۔ اس کی طرف سے خون بہاؤ (یعنی جانور ذبح کرو) اور اس سے گندگی دور کرو۔''

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ گندگی دور کرنے سے مراد سر کے بال منڈانا ہے۔

(ترمذی: ۲۸۴۰)

حضرت علی بن ابی طالبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن کے عقیقے کے موقع پر ایک بکری ذبح کی اور فرمایا: ''اے فاطمہ! اس کا سر منڈاؤ اور اس کے بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کرو۔'' (ترمذی: ۱۵۱۹، احمد ۶/ ۳۹۰، ۳۹۲)

اسی وجہ سے جمہور فقہاء بچے کے سر کے بال منڈانے کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ البتہ احناف کہتے ہیں کہ یہ مباح ہے۔ نہ سنت ہے نہ واجب۔

(الفتاوى البزازية على هامش الفتاوى الهندية، بولاق ۶/ ۳۷۱)

یہ حکم عام حالات میں ہے۔ جو لوگ سر منڈانے کے استحباب کے قائل ہیں، ان کے نزدیک بھی مرض کی صورت میں سر منڈائے بغیر عقیقہ ہو جائے گا اور شرعی اعتبار سے اس میں کوئی کمی نہیں واقع ہوگی۔

بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا حق

سوال: ایک حدیث نظر سے گزری ہے جس کا مضمون کچھ یوں ہے: ''ایک عورت اپنے دودھ پیتے بچے کو لے کر اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے۔ میں نے حمل اور وضع حمل کی تکلیفیں برداشت کی ہیں، ابھی یہ میرا دودھ پیتا ہے اور

میری آغوش تربیت کا محتاج ہے، لیکن اس کا باپ، جس نے مجھے طلاق دے دی ہے، چاہتا ہے کہ اسے مجھ سے چھین لے۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''تم اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک تمھارا کہیں اور نکاح نہ ہو جائے۔''

اس حدیث کے ضمن میں درج ذیل سوالات ابھرتے ہیں:

۱- اگر ماں کسی اور سے نکاح کر لے تو ایسی صورت میں کیا ماں کا حق حضانت پوری طرح ساقط ہو جاتا ہے اور بچے کو مطلقہ سے لے لینے کا باپ پوری طرح حق دار ہوگا؟ حدیث کے الفاظ سے تو یہی بات مترشح ہوتی ہے۔

۲- بچہ ماں کے پاس ہو یا ماں جس کے پاس بھی اسے پرورش کے لیے رکھے، وہ مقام کہیں اور ہو اور بچے کا باپ جہاں اپنے اہل خاندان مثلاً بچے کی دادی، دادا، پھوپھی اور چچا وغیرہ کے ساتھ مقیم ہو اور وہیں اس کا پھیلا ہوا کاروبار بھی ہو وہ مقام بچے کی جائے قیام سے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر ہو، تب بھی بچے کی ماں اگر فقہ کے اس مسئلے کا حوالہ دے کہ ماں کے بعد بچے کی پرورش کا حق نانی کو منتقل ہو جاتا ہے اور بچے کو اپنی ماں کے پاس رکھنے پر مصر ہو تو یہ کہاں تک صحیح اور درست ہوگا؟ جب کہ بچے کی پرورش اس کی صحت اور تعلیم و تربیت پر نگاہ رکھنا اور وقتاً فوقتاً بچے سے ملنا اور ملتے رہنا اور بچے کو اپنے سے مانوس رکھنا، طویل فاصلے کی بنا پر باپ کے لیے ممکنات میں سے نہ ہو۔ ایسی صورت میں ماں کا یہ طرز عمل اور اس پر اصرار کیا شرعاً صحیح اور درست ہوگا؟

۳- پھر یہ کہ طلاق کے بعد بچے کی ماں کے گھر والوں یعنی نانا، نانی وغیرہ سے اس کے باپ کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے ہوں اور وہ ان کے گھر میں قدم رکھنا بھی پسند نہ کرتا ہو تو ایسی صورت میں بچے کو نانی کے پاس رکھنا بچے سے باپ کے تعلق کو کیا عملاً ختم کر دینے کے مترادف نہیں ہوگا۔ شرعاً یہ کہاں تک درست ہے؟

۴- پھر ایک بات اور یہ کہ اگر نانی اپنے گھر کی اکیلی خاتون ہوں، لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہو، بڑے لڑکے شادیوں کے بعد ماں باپ سے علیحدہ رہتے ہوں، ایسی صورت میں نانی پر بچے کی پرورش کی ذمہ داری ڈالنا کہاں تک صحیح اور درست ہوگا، جب کہ بچے کا

باپ اس کے لیے بالکل تیار نہ ہو اور اس کو وہ اپنی اور اپنے بچے کی بہت بڑی حق تلفی قرار دیتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا شریعت اس طرح کے جبر کی اجازت دے گی؟

۵- دوسری طرف بچے کے باپ کے گھر والے مثلاً بچہ کی دادی، دادا، پھوپھی، چچا وغیرہ بچے کو اپنانے اور دل وجان سے اس کی پرورش اور نگہداشت کرنے کے لیے تیار ہوں تو شرعاً ترجیح کس کو دی جائے گی؟ جب کہ بچے کا باپ بھی اپنے والدین ہی کے ساتھ رہتا ہو اور کاروبار بھی مشترک ہو اور بچے کا باپ بھی دل وجان سے یہی چاہتا ہو کہ اس کا لختِ جگر ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رہے اور پیار ومحبت کے ماحول میں اس کی راست نگرانی میں بچے کی پرورش، تعلیم وتربیت اور تعمیر اخلاق کا نظم ہو اور عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ سہولتیں اور آسائشیں بھی بچے کو ملیں۔

بہ راہ کرم حدیث بالا کے ضمن میں ابھرنے والے سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

جواب: اسلام نے بنیادی انسانی حقوق کی پاس داری کی ہے۔ اس نے بچے کا یہ حق بتایا ہے کہ پیدائش کے بعد اس کی پرورش و پرداخت کی جائے، اس کی صحت کا خیال رکھا جائے، اسے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے، اس کی دینی واخلاقی تربیت پر بھرپور توجہ دی جائے اور اسے پال پوس کر اس طرح بڑا کیا جائے کہ کاروبارِ زندگی میں وہ اپنا مطلوبہ کردار سرانجام دے سکے۔ اصطلاحِ شریعت میں اس حق کو حضانت کہا جاتا ہے۔ اس حق کی ادائی جس پر واجب ہے اگر وہ کوئی ایک فرد ہو، جیسے صرف ماں ہو، یا دیگر افراد بھی ہوں مگر بچہ ماں کے علاوہ کسی دوسرے کو نہ قبول کرتا ہو تو یہ وجوب عین ہے اور دیگر افراد ہوں اور بچہ ان کے پاس رہ سکتا ہو تو یہ وجوبِ کفایہ ہے، کوئی فرد اس ذمہ داری کو قبول کرلے تو دوسروں سے وجوب ساقط ہو جائے گا۔ جن لوگوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے اگر وہ اس کی ادائی میں کوتاہی کریں گے تو ان سے باز پرس ہوگی۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔ (بخاری: ۷۱۳۸، مسلم: ۱۸۲۹)

''تم میں سے ہر شخص راعی یعنی نگراں ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

بچے کی پرورش کی بہترین صورت تو یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ دونوں کے زیر سایۂ عاطفت پروان چڑھے، دونوں مل کر اس کی جسمانی و عقلی نشو ونما اور تعلیم و تربیت پر توجہ دیں اور اس کی بنیادی ضروریات پوری کریں۔ لیکن بسا اوقات دونوں میں علیٰحدگی ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں شریعت میں بچے، اس کی ماں اور اس کے باپ تینوں کے حقوق کی رعایت کی گئی ہے، تاکہ ایک طرف بچے کی صحیح ڈھنگ سے پرورش و پرداخت ہو سکے، دوسری طرف ہر حق دار کو اس کا جائز حق ملے اور تیسری طرف کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ چناں چہ کسی کی بے جا طرف داری کی گئی ہے نہ کسی کے حق کو پامال کیا گیا ہے۔ ذیل میں مسئلہ حضانت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی جا رہی ہے:

(۱) نومولود اور چھوٹے بچے کی پرورش کا پہلا حق اس کی ماں کا ہے۔ وہی اس کو دودھ پلاتی ہے، وہی اس کی اچھی طرح پرورش کر سکتی ہے۔ چھوٹے بچے کی جتنی اچھی طرح دیکھ بھال ماں کر سکتی ہے، باپ نہیں کر سکتا۔ نہلانا، دھلانا، تیل کی مالش کرنا، پیشاب پاخانہ کر دینے کی صورت میں صفائی کرنا، گندے کپڑے بدلنا اور صاف ستھرے کپڑے پہنانا، کھلانا، پلانا اور دیگر ڈھیر سے کام جتنی تن دہی سے ماں انجام دے سکتی ہے، باپ نہیں انجام دے سکتا۔ وہ اس کے لیے اپنا جتنا وقت فارغ کر سکتی ہے، باپ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے بچے کے مفاد میں ماں کا حق مقدم رکھا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کی جائے قرار تھی، میری آغوش نے اسے پالا ہے، میرے سینے سے اس نے دودھ پیا ہے، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور چاہتا ہے کہ اسے مجھ سے چھین لے۔ آپؐ نے فرمایا: اَنْتَ اَحَقُّ بِهٖ مَالَمْ تَنْكِحِيْ ''تم اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک تمھارا نکاح کہیں اور نہ ہو جائے (سنن ابی داؤد: ۲۲۷۶، اسے احمد، بیہقی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے) بعض روایات میں ہے کہ اسی طرح کے ایک تنازعہ میں حضرت ابوبکرؓ نے ماں کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''بچے سے پیار، محبت و رافت، لطف و کرم، رحم دلی و ہم دردی اور

بھلائی ماں کو زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس کی زیادہ حق دار ہے، جب تک اس کا کہیں اور نکاح نہ ہو جائے۔

(فقہ السنہ، السید سابق، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۳ء، ۲/۳۴۰)

'کہیں اور نکاح ہو جانے' کی قید بہت حکمت پر مبنی ہے۔ ممکن ہے کہ ماں نے جس شخص سے نکاح کیا ہے وہ بچے کے لیے اجنبی ہو، اسے اس بچے سے ویسی محبت نہیں ہو سکتی جیسی اپنے بچے سے ہوتی ہے۔ اس لیے اندیشہ ہے کہ اگر بچہ اپنی ماں کے ساتھ رہے گا تو صحیح طریقے سے اس کی دیکھ بھال نہ ہو سکے گی۔ لیکن ایسا ہر حال میں ضروری نہیں ہے۔ اس بچے کی خبر گیری کرنے والا ماں کے علاوہ کوئی نہ ہو، یا ہو مگر کسی وجہ سے اس کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہو، یا ماں کے بعد جس شخص کو حق حاصل ہو وہ خاموش رہے، اسے ماں کے ساتھ بچے کے رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہو، بچے کی ماں نے جس شخص سے نکاح کیا ہے وہ بچے کا رشتہ دار ہو، یا رشتہ دار نہ ہو مگر بچہ کو بہ خوشی اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو تو ان صورتوں میں ماں کا حق حضانت ساقط نہیں ہوتا۔ حضرت ام سلمہؓ کا نکاح جب رسول اللہ ﷺ سے ہوا اس وقت ان کے سابق شوہر حضرت ابو سلمہؓ سے ان کی بچی زینب بہت چھوٹی تھی، ابھی دودھ پیتی تھی، وہ برابر ان کے ساتھ رہی اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں اس کی پرورش ہوئی۔

(۲) عام حالات میں بچے کو وہیں رکھنا ضروری ہے جہاں اس کے باپ کا قیام ہو۔ اس لیے کہ شریعت نے باپ کو بچے کی تعلیم و تربیت اور مجموعی خبر گیری کا ذمہ دار بنایا ہے اور اسے بچے کو دیکھنے کا بھی حق حاصل ہے۔ اس لیے ماں باپ میں سے کوئی بھی اگر دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہو تو ماں کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔ یہ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا مسلک ہے۔ احناف کے نزدیک ماں بچے کے ساتھ کسی دوسرے قریبی شہر میں رہ سکتی ہے، جہاں باپ کی بہ آسانی آمد و رفت ہو سکتی ہو۔ اسی طرح وہ اسے کسی دور دراز شہر میں بھی لے جا سکتی ہے اگر وہ شہر اس کا وطن ہو۔

(الموسوعة الفقهية، کویت، ۱۷/۳۰۳-۳۱۱)

اس سلسلے میں شیخ سید سابق کی درج ذیل بات صحیح معلوم ہوتی ہے:

''بچے کے ماں باپ میں سے کوئی ایک دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہو تو بچہ کس کے پاس رہے؟ اس سلسلے میں یہ دیکھا جائے گا کہ بچہ کا کس کے پاس رہنا زیادہ بہتر اور مفید ہے اور کس کے پاس وہ زیادہ محفوظ رہے گا۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی دوسرے شہر منتقلی کہیں دوسرے فریق کو پریشان کرنے اور اس کو بچے سے محروم کرنے کے مقصد سے تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو بچے کو اس کے ساتھ نہیں بھیجا جائے گا۔''

(فقہ السنۃ، ۲/ ۳۵۲)

(۳) اگر بچہ اپنی ماں، نانی یا کسی اور مستحقِ حضانت کے پاس ہو تو باپ کو بچے سے ملاقات کرنے، اسے دیکھنے اور اس کی خبر گیری کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ طلاق کے بعد باپ کے تعلقات اس کی سسرال والوں سے کشیدہ ہو جاتے ہیں، لیکن دین داری کا تقاضا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں اور ان کی پاس داری کریں۔ کشیدگی کی بنا پر ماں یا نانی کو ان کے حقِ حضانت سے محروم کیا جاسکتا ہے نہ باپ کو اپنے بچے سے تعلق رکھنے سے روکا جاسکتا ہے۔

(۴) کوئی مستحق حضانت اپنے حق سے دست بردار ہونا چاہے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر وہ اپنا حق استعمال کرنا چاہے تو اسے اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ نانی تنہا رہتی ہو، اسے بچے کی پرورش کی ذمہ داری اٹھانے میں دشواری ہو تو وہ اس سے معذرت کر سکتی ہے۔ اس صورت میں بچہ کو اس شخص کی پرورش میں دیا جائے گا جو اس کے بعد مستحقِ حضانت ہو۔ استحقاقِ حضانت کی بنیاد شریعت میں اس بات پر نہیں رکھی گئی ہے کہ باپ اس کے لیے تیار ہے یا نہیں اور بچے کے کسی دوسرے کے پاس رہنے کو وہ اپنی حق تلفی سمجھتا ہے یا نہیں۔ البتہ فقہاء نے استحقاق حضانت کے لیے بعض شرائط بیان کی ہیں، مثلاً یہ کہ مستحقِ حضانت مسلمان ہو، بالغ و عاقل ہو، دین دار ہو اور اس کا فسق و فجور عام نہ ہو، وہ بچے کی پرورش کرنے پر قادر ہو، بڑھاپے، مرض یا کسی مصروفیت کی بنا پر اس سے معذور نہ ہو، اسے کوئی متعدی مرض نہ ہو، جہاں اس کا قیام ہو وہ جگہ محفوظ و مامون ہو، وغیرہ۔ ان میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو اس کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔

(۵) فقہاء نے روحِ شریعت کو پیش نظر رکھ کر مستحقینِ حضانت کی ایک ترتیب قائم کی ہے، جو درج ذیل ہے:

ماں۔ نانی۔ دادی۔ بہن۔ بھانجی۔ خالہ۔ بھتیجی۔ پھوپھی۔ ماں کی خالہ۔ باپ کی خالہ۔ ماں باپ کی پھوپھی۔ باپ۔ دادا۔ بھائی۔ بھتیجا۔ چچا۔ چچازاد بھائی وغیرہ۔

اس ترتیب میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ بچے کی اچھی طرح پرورش و پرداخت کس کے پاس رہ کر ہوسکتی ہے۔ کسی غیر مستحقِ حضانت کے لیے روا نہیں کہ محض اپنی خواہش کی بنا پر حقِ حضانت کا دعویٰ اور اسے حاصل کرنے پر اصرار کرے۔ اس لیے یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ بچے کے باپ کے گھر والے بچے کو اپنانے کے لیے پوری طرح تیار ہوں اور باپ بھی یہی چاہتا ہو تو بچے کو ان کے حوالے کر دینا چاہیے۔

(٦) اس سلسلے میں مدتِ حضانت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حضانت کا آغاز بچے کی پیدائش سے ہوجاتا ہے اور اس کی آخری مدت یہ ہے کہ وہ سنِ شعور کو پہنچ جائے اور اپنے بنیادی ضروری کام خود سے انجام دینے لگے۔ احناف نے لڑکے کے لیے اس کی مدت سات سال اور لڑکی کے لیے نو سال متعین کی ہے۔ لڑکی کی مدتِ حضانت زیادہ رکھنے کی حکمت یہ ہے کہ اس کی اچھی طرح نسوانی تربیت ہوجائے۔

مدتِ حضانت پوری ہونے کے بعد بچہ کس کے پاس رہے گا؟ اس سلسلے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ عہد نبوی کے بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچے کو اختیار دیا تھا کہ وہ ماں باپ، جس کے ساتھ چاہے، رہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور قاضی شریحؒ نے بھی بعض مقدمات میں یہی فیصلہ کیا تھا۔ اس بنا پر شوافع اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مدتِ حضانت ختم ہونے کے بعد باپ بچے کو اپنے پاس رکھنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اسی کو اس کی کفالت اور تعلیم و تربیت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ باپ کی یہ ولایت بچے کے بالغ ہونے تک ہے۔ اس کے بعد اسے اختیار ہوگا کہ وہ جس کے ساتھ رہنا چاہے رہے۔ ملحوظ رہے کہ اس رائے کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ بچے کی صحیح ڈھنگ سے تعلیم اور دینی و اخلاقی تربیت کس کے پاس ہوسکتی ہے۔ اگر باپ لاابالی ہو، یا کسی بنا پر بچے کی تعلیم و تربیت سے

قاصر ہو اور ماں اس کام کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہو تو بچے کو اسی کے پاس رہنے دیا جائے گا۔

حقِ حضانت کے مسئلے پر فریقین یعنی بچے کے ماں باپ کو جذبات سے بالاتر ہو کر غور کرنا چاہیے، اور کسی ایسے فیصلے پر باہم رضا مند ہو جانا چاہیے جس میں بچے کا زیادہ فائدہ ہو، خواہ اس کے لیے انھیں اپنی خواہشات کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

(۲)

سوال: آپ نے عورت کے حق حضانت کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی حدیث اور حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ نقل فرمایا ہے، اس سے چند سوالات ابھرتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ایک خاتون اپنا مقدمہ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کرتی ہے، اس پر آپؐ کا یہ فرمانا کہ تم ہی اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک تمھارا نکاح کہیں اور نہ ہو جائے۔ اس جواب سے جو مفہوم نکلتا ہے اور اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ کن حالات میں کس کا حق مقدم ہے۔ یقیناً جب تک ماں نکاح نہ کرے، اس کا حق مقدم اور جب نکاح کرلے تو باپ کا حق مقدم۔ اگر باپ کے علاوہ کسی اور کو حق حضانت ہونے کی بات ہوتی تو حضورؐ اس کا بھی ذکر یقیناً فرماتے۔ مگر آپؐ کا یہ اصولی جواب کافی غور طلب ہے۔ مقدمہ میں عورت یہ کہتی ہے کہ بچے کا باپ طلاق دے دینے کے بعد بچے کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے اور حضور فرماتے ہیں کہ جب تک تو نکاح نہ کرے تو اس کی زیادہ حق دار ہے۔ گویا نکاح ہو جانے کے بعد، پہلے تجھے جو حق حاصل تھا، وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اب باپ کا حق، جو پہلے مؤخر تھا، مقدم بن چکا ہے۔ یہی مفہوم اس حدیث رسول کا نکلتا ہے۔ اب اس سیدھے سادے جواب کی موجودگی میں یہ کہنا کہ نانی کو یا فلاں اور فلاں کو اس کا حق ملتا ہے یا ملنا چاہیے، حضورؐ کے جواب پر ایک اضافہ ہے۔ باپ اگر بچے کی پرورش کا پوری طرح اہل ہو اور اس کے اہل خاندان مثلاً اس کی ماں (جس کا حقِ حضانت آپ کی بیان کردہ فہرست کے مطابق نانی کے بعد آتا ہے) وغیرہ بھی سلامت ہوں اور وہ حضانت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہوں تو کسی اور طرف دیکھنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

آپ نے اس سلسلے میں حضرت ام سلمہؓ اور حضورؐ کی مثال پیش فرمائی ہے اور اس سے جو

استدلال فرمایا ہے اس سے اتفاق نہایت مشکل ہے۔ حضورؐ کا مثالی اخلاق اور آج کل امت مسلمہ کی جیسی کچھ اخلاقی صورت حال ہے دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا ایسی بلند و بالا اور منفرد مثالوں سے استدلال عملی طور پر صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ادباً گزارش ہے کہ ایسی اونچی مثالوں سے استدلال نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ماں کے بعد باپ ہی اپنے بچے کا زیادہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بچے کو اپنی نگہ داشت میں رکھ سکتا ہو تو اسی کو اوّلیت دینی چاہیے۔ میرے خیال میں روحِ شریعت سے یہی بات زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ واقعی اگر باپ کسی وجہ سے اس کا اہل نہ ہو، یا اہل تو ہو مگر اس کے حالات اس کے متحمل نہ ہوں یا اس کی ماں یعنی بچے کی دادی صحت مند نہ ہو (یا حیات نہ ہو) اور بارِ حضانت اٹھانے کی متحمل نہ ہو، اس صورت میں دوسرے مستحقینِ حضانت کے تعلق سے سوچنا چاہیے۔ لیکن اگر باپ کو ایسی کوئی مجبوری یا معذوری لاحق نہ ہو تو ماں کے بعد اسی کو حقِ حضانت دینا چاہیے، تاکہ وہ بچے کو اپنے سے قریب اور اپنی نگرانی میں رکھے اور اگر ضرورت متقاضی ہو تو ملازمین کی خدمات بھی اپنی ماں کی سرپرستی میں فراہم کرے، تاکہ بچے کی بہتر سے بہتر انداز میں پرورش و نگہ داشت ہو سکے۔

فقہاء نے حضانت کے سلسلے میں جو ترتیب بیان فرمائی ہے وہ کوئی ایسی نص نہیں ہے کہ اس ترتیب میں حالات اور مصالح اگر متقاضی ہوں تب بھی کوئی تقدیم و تاخیر روا نہ رکھی جائے۔ فقہاء نے ایک مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو یقیناً بیان فرمایا ہے، لیکن مصالح اور حالات جس بات کے متقاضی ہوں ان کو ترجیح دینا حکمتِ شریعت اور عقل عام کا عین منشا اور تقاضا معلوم ہوتا ہے۔

جواب: حدیث ''اَنْتَ اَحَقُّ بِهٖ مَالَمْ تَنْکِحِیْ'' سے آپ نے جو استنباطات کیے ہیں ان کے بارے میں بنیادی بات یہ عرض کر دینی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کسی مسئلہ کی کوئی قانونی شق مستنبط کرتے وقت صرف ایک ہی حدیث کو پیشِ نگاہ رکھنا کافی نہیں ہے، بل کہ اللہ کے رسول ﷺ کے دیگر اقوال، افعال اور عملِ صحابہ کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا، تبھی مسئلہ کی صحیح نوعیت واضح ہوگی، ورنہ غلطی میں پڑنے کا امکان ہے۔ اس حدیث سے آپ کا پہلا استنباط کہ ماں کے نکاح کرتے ہی اس کا حقِ حضانت ختم ہو جانا چاہیے، پورے طور پر درست نہیں ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کا دوبارہ نکاح ہو جانے کے باوجود ان کی بیٹی زینب ان کے ساتھ رہی۔ معلوم نہیں کیوں آپ اس واقعہ

سے استدلال درست نہیں سمجھتے۔ یہاں زیر بحث افراد نہیں، بل کہ صورتِ واقعہ ہے۔ اس کا ثبوت خود قرآن سے بھی ملتا ہے۔ سورۂ نساء میں محرمات (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے) کی جو فہرست پیش کی گئی ہے اس میں ایک قسم یہ بھی ہے:

وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ

(النساء: ۲۳)

''اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے تمھاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔''

اگر ماں کے دوبارہ نکاح کر لینے کے بعد، اس کا اپنی بچی کو اپنے ساتھ رکھنا جائز ہی نہ ہوتا تو قرآن عورتوں کی اس قسم کا تذکرہ ہی نہ کرتا۔

آپ کا دوسرا استنباط کہ ماں کا حق حضانت ختم ہوجائے تو باپ کو اس کا حق دے دینا چاہیے، نانی یا کسی اور کو یہ حق دینا درست نہیں، یہ استنباط بھی صحیح نہیں ہے۔ کتب حدیث میں عہدِ صحابہ کے بعض نظائر موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حق ماں کے بعد نانی کو دیا گیا۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے عہد کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک انصاری عورت سے نکاح کیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد اسے طلاق دے دی۔ اس سے ایک بچہ ہوا جس کا نام عاصم تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے بچے کو لینا چاہا تو اس کی نانی نے، جس کی پرورش میں وہ بچہ تھا، کیوں کہ اس کی ماں کا نکاح دوسرے شخص سے ہوگیا تھا (و أم عاصم یومئذ حیة متزوجة) حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں مرافعہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے نانی کے حق میں فیصلہ کردیا اور حضرت عمرؓ پر نفقہ لازم کیا۔ (اِنَّ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ طَلَّقَ اُمَّ عَاصِمٍ فَكَانَ فِیْ حِجْرِ جَدَّتِهٖ فَخَاصَمَتْهُ اِلٰی أَبِیْ بَكْرٍ فَقَضٰی اَنْ يَّكُوْنَ الْوَلَدُ مَعَ جَدَّتِهٖ وَالنَّفَقَةُ عَلٰی عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ قَالَ هِیَ أَحَقُّ بِهٖ) السنن الکبریٰ البیہقی، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، ۸/ ۴-۵، امام بیہقیؒ نے اس مضمون کی متعدد روایتیں جمع کردی ہیں اور ان سے استنباط کرتے ہوئے یہ عنوان قائم کیا ہے: باب الام تتزوج فیسقط حقّھا من حضانة الولد و ینتقل الی جدّته (اس چیز کا بیان کہ ماں نکاح کرلے تو اس کا حقِ حضانت ساقط ہوجائے گا اور وہ بچے کی نانی کی طرف منتقل ہوجائے گا)

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر بچے کی ماں موجود نہ ہو یا اس کا حقِ حضانت کسی وجہ سے ساقط ہو گیا ہو تو استحقاق حضانت میں ماں کے سلسلے کی عورتیں باپ کے سلسلے کی عورتوں سے مقدم ہوں گی۔ اگر مستحق حضانت کوئی عورت نہ ہو، یا اس کے لیے آمادہ نہ ہو یا کسی شرعی سبب سے اس کا حق ساقط ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں جو عصباتی رشتہ دار وراثت میں مقدم ہیں وہ حضانت میں بھی مقدم ہوں گے۔ جیسے باپ، پھر دادا، پھر بھائی وغیرہ۔

لیکن اس کے ساتھ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ بچے کا حقیقی ولی باپ ہے، اگر چہ ماں یا اس کے سلسلے کی کوئی دوسری عورت بچے کا حقِ حضانت رکھتی ہو، لیکن بچے کی نگرانی، نگہ داشت اور تعلیم و تربیت کا حق باپ کا ہے۔ اگر وہ بچے کو کسی ایسی جگہ لے جانا چاہے جہاں باپ اس کی نگرانی اور نگہ داشت نہیں کر سکتا تو وہ حقِ حضانت کھو دیتی ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بچے کو اسی شہر میں رکھنا ضروری ہے جہاں باپ رہتا ہو۔ کوئی مجبوری ہو تو زیادہ سے زیادہ بچے کو اتنے فاصلے پر رکھا جا سکتا ہے کہ باپ آسانی سے اس تک پہنچ سکے اور بہ سہولت اس کی نگرانی و خبر گیری کر سکے۔

آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ فقہاء نے حضانت کے سلسلے میں جو ترتیب بیان کی ہے وہ کوئی ایسی نص نہیں ہے کہ اس میں حالات اور مصالح کے متقاضی ہونے کے باوجود کوئی تقدیم و تاخیر جائز نہ ہو۔ فقہاء نے عام حالات میں مستحقینِ حضانت کی ایک فہرست مرتب کر دی ہے۔ اس ترتیب میں انھوں نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ کس کے پاس بچے کی پرورش اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ بچے کا مفاد مقدم رکھا جائے گا اور حالات کے تقاضے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ چناں چہ کبھی بچے کا اپنی ماں کے پاس رہنا اس کے حق میں زیادہ مفید ہو گا، کبھی ماں کی ماں (نانی) یا دوسرے رشتہ دار کے پاس اس کا رہنا زیادہ فائدہ مند ہو گا، کبھی خود بچے کو یہ اختیار دینا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ کس کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں مذکورہ صورتوں میں سے ہر ایک کی نظیریں موجود ہیں۔ اور اگر حالات مظہر ہوں کہ ماں کے زیر پرورش دینے سے بچے کو دینی یا دنیوی اعتبار سے کوئی نقصان پہنچنے کا امکان ہے تو ماں کے موجود اور غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود اس کے حوالے نہ کرنا

زیادہ قرینِ صواب ہوگا، لیکن یہ فیصلہ کرنے کا اختیار مسلم ممالک میں عدالتوں، یا دارالقضاء کے قاضی کو ہوگا کہ وہ فریقین کی باتوں اور ان کے دلائل سن کر اور حالات کا باریکی سے جائزہ لے کر کوئی ایسا فیصلہ کرے جو بچے کے حق میں بہتر ہو۔ چناں چہ پڑوسی ملک پاکستان کی عدالتوں میں ایسے متعدد فیصلے ہوئے ہیں جن میں حالات کو پیش نظر رکھ کر فقہاء کی مبینہ فہرستِ مستحقین حضانت کے برخلاف فیصلہ کیا گیا ہے۔

اس موضوع پر پاکستانی دانش ور جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے اپنی کتاب 'مجموعہ قوانین اسلام' (ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان، جلد سوم، ص ۸۷۷-۹۰۹) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ انھوں نے مسلم ممالک: تیونس، شام، عراق، مصر، اردن میں حضانت کے موضوع پر رائج الوقت قوانین کی دفعات نقل کی ہیں اور پاکستانی عدالتوں کے فیصلے بھی تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

نقلِ مکانی کی صورت میں عورت کا حق حضانت

سوال: 'بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا حق' کے زیر عنوان بعض سوالات کے جو جوابات دیے گئے ہیں، ان کی ایک شق سے متعلق کچھ وضاحت مطلوب ہے۔

لکھا گیا ہے کہ ''عام حالات میں بچے کو وہیں رکھنا ضروری ہے، جہاں اس کے باپ کا قیام ہو، اس لیے ماں باپ میں سے کوئی بھی اگر دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہو تو ماں کا حقِ حضانت ساقط ہو جائے گا۔'' آگے اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''بچے کا حقیقی ولی باپ ہے، اگرچہ ماں یا اس سلسلے کی کوئی دوسری عورت بچے کا حق حضانت رکھتی ہو، لیکن بچے کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کا حق باپ کا ہے۔ اگر وہ بچے کو کسی ایسی جگہ (لے جانا چاہے) جہاں باپ اس کی نگرانی اور نگہ داشت نہیں کر سکتا تو وہ حق حضانت کھو دیتی ہے۔''

موجودہ دور میں حالات پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئے ہیں۔ شادیاں دور دراز کے علاقوں سے ہونے لگی ہیں، پھر لڑکے کی ملازمت یا کاروبار اپنے وطن سے دور کسی جگہ ہو تو شادی شدہ جوڑا وہاں رہنے لگتا ہے۔ اب اگر نا اتفاقی کی بنا پر زوجین کے درمیان علیٰحدگی

ہو جائے اور ان کے درمیان کوئی بچہ ہو تو ظاہر ہے کہ علاحدگی کے بعد محض بچے کی پرورش کے لیے اس کی ماں اس شہر میں نہیں رکے گی، جہاں بچے کا باپ رہتا ہے۔ بل کہ اس شہر میں آ جائے گی جہاں اس کے ماں باپ یا کوئی قریبی عزیز رہتا ہے اور اگر اس کا دوسرا نکاح ہو جائے تو وہ اپنے شوہر کے شہر میں منتقل ہو جائے گی۔ کیا اس نقلِ مکانی کی بنا پر عورت اپنے حق حضانت سے محروم ہو جائے گی؟

جواب: زیر بحث مسئلے کی دو شقیں ہیں: ایک باپ کا حق ولایت، دوسری نقلِ مکانی کی صورت میں مستحق حضانت کا حق باقی رہنا یا ختم ہو جانا۔

زوجین کی کسی وجہ سے علاحدگی ہو جائے اور ان کے درمیان ایک بچہ ہو تو باپ کا حق ولایت ہر حال میں قائم رہتا ہے، چاہے بچہ کسی کی بھی پرورش میں ہو۔ ولایت میں اس سے ملنا جلنا، اس کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرنا، اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا اور اس کی کفالت کرنا سب چیزیں شامل ہیں۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے اور یہ چیز اسلام کے نظامِ خاندان کے عین مطابق ہے۔

بچہ ماں کی پرورش میں ہو اور ماں اس شہر سے جہاں بچے کا باپ رہتا ہے، کسی دوسرے شہر میں منتقل ہو جائے تو اس کا حق حضانت باقی رہتا ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیلات و جزئیات میں فقہا کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف اس بات پر مبنی ہے کہ ماں کے نقل مکانی کی صورت میں باپ ولایت کی ذمہ داری ادا کر پائے گا یا نہیں؟ جن فقہاء کے نزدیک اس صورت میں باپ فرائض ولایت کی انجام دہی سے قاصر رہے گا وہ ماں کا حقِ حضانت ساقط قرار دیتے ہیں اور جو فقہا سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی باپ بچے کی خبر گیری اور کفالت کر سکتا ہے وہ ماں کا حق حضانت باقی رکھتے ہیں۔

فقہائے ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) کہتے ہیں کہ اگر ماں دوسرے شہر منتقل ہو جائے تو حق حضانت باپ کو حاصل ہو جائے گا، تاکہ وہ بچے کی تربیت، تادیب اور تعلیم کا نظم کر سکے۔ قاضی شریح نے ایک موقع پر یہی فیصلہ کیا تھا۔ امام احمدؒ سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ اس صورت میں بھی ماں کو حقِ حضانت حاصل رہے گا۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر ماں اپنے وطن (جہاں رہتے ہوئے اس کا نکاح ہوا تھا) منتقل ہوئی ہو تو اس کا حق حضانت باقی رہے گا اور اگر اس کا نقل مکانی کہیں اور ہوا ہو تو یہ حق باپ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ سے ایک دوسری روایت یہ منقول ہے کہ اگر ماں شہر سے منتقل ہو کر گاؤں میں جا رہی ہے تو حق حضانت باپ کو حاصل ہو جائے گا، لیکن اگر وہ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہو رہی ہے تو اس کا استحقاق باقی رہے گا۔

فقہائے کرام کی یہ آراء اپنے زمانے کے اعتبار سے ہیں۔ پہلے سفر میں بہت دشواریاں تھیں۔ راستے پرخطر رہتے تھے، ذرائع نقل وحمل محدود تھے، ایک جگہ سے دوسری جگہ اگر دور ہو تو وہاں پہنچنا بہت زحمت طلب ہوتا تھا اور کافی وقت بھی لگتا تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ رائے دی کہ ماں کے دوسرے جگہ منتقل ہو جانے کی صورت میں اس کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس صورت میں حق ولایت سے باپ کی محرومی لازم آتی تھی۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ راستے پر امن ہیں اور دور دراز مقامات تک بھی بہ آسانی اور کم سے کم وقت میں پہنچا جا سکتا ہے۔ فقہ کا اصول ہے کہ زمانہ اور حالات بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں محض نقل مکانی کو ماں کے استحقاق حضانت سے محرومی کی بنیاد بنانا درست نہیں معلوم ہوتا۔

عصر حاضر میں عالم اسلام کے مشہور فقیہ سید سابق نے اپنی مایہ ناز تصنیف 'فقہ السنۃ' میں فقہائے کرام کے مذکورہ بالا اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ تمام اقوال، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، کسی ایسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں جس پر دل مطمئن ہو جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ میں سے کوئی دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ بچے کا ان میں سے کس کے پاس رہنا اس کے حق میں بہتر اور زیادہ فائدہ مند ہے۔ بچے کا فائدہ، اس کی نگرانی اور حفاظت ماں باپ میں سے جس کے پاس زیادہ ہو اسی کے پاس بچے کو رکھا جائے گا۔ اس معاملے میں منتقلی یا عدم منتقلی کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

(فقہ السنۃ، دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۸۳ء، ۲/ ۳۵۲)

اگر ماں باپ کے حکم میں اختلاف ہو...

سوال: اگر والدین (ماں باپ) اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو کوئی حکم دیں اور اس حکم میں دونوں (ماں

باپ) کے درمیان اختلاف ہو جائے اور ان میں سے کوئی حکم معصیت پر مبنی بھی نہ ہو تو اولاد پر کس کے حکم کی تعمیل لازم ہے؟ بہ طورِ مثال میری والدہ مجھ سے کہیں کہ تم دہلی سے علی گڑھ جاؤ اور والد صاحب وہاں جانے سے منع کریں تو مجھ پر کیا لازم ہے؟ مجھے کس کا حکم ماننا چاہیے؟

میں نے جمعہ کے ایک خطبے میں سنا ہے کہ خدمت ماں کی باپ پر مقدم ہے، مگر حکم باپ کا ماں کے حکم پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ باپ گھر کا ذمہ دار اور نگراں ہوتا ہے، اس لیے اس کے حکم کی تعمیل لازم ہے۔ امام صاحب نے یہ بھی کہا کہ ماں کا درجہ باپ کی نسبت تین گنا زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات نہ قرآن میں کہیں مذکور ہے نہ حدیث میں۔

آپ سے گزارش ہے کہ قرآن و حدیث کے حوالے سے تحریر فرمائیں کہ یہ دونوں باتیں کہاں تک صحیح ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد میں سب سے بڑھ کر حق والدین کا قرار دیا ہے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید کی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا صریح حکم موجود ہے۔ (البقرۃ: ۸۳، النساء: ۳۶، الانعام: ۱۵۱، بنی اسرائیل: ۲۳، العنکبوت: ۸، لقمان: ۱۴، الاحقاف: ۱۵) سورۂ بنی اسرائیل میں بہت دل کش اور مؤثر اسلوب میں کہا گیا ہے کہ ''اگر ماں باپ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے تک زندہ رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بل کہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔'' (آیات: ۲۳-۲۴) احادیث میں بھی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب عمل اور ان کی نافرمانی کو سب سے بڑا گناہ (اکبر الکبائر) قرار دیا گیا ہے۔ (بخاری و مسلم) آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی دونوں میں 'والدین' کا لفظ آیا ہے، جس میں ماں باپ دونوں شامل ہیں۔ لیکن بعض آیات اور احادیث سے اشارہ ملتا ہے کہ حسنِ سلوک کے معاملے میں ماں کا درجہ باپ سے بڑھ کر ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے کہا: پھر کون؟ فرمایا:

تمھارا باپ۔'' (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبة، حدیث:۵۹۷۱)

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بعض محدثین کرام کے حوالے سے لکھا ہے:

''ابن بطالؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن سلوک کے معاملے میں ماں کا درجہ باپ کے مقابلے میں تین گنا بڑھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تین کام ماں تنہا انجام دیتی ہے۔ وہ حمل، پھر وضع حمل پھر رضاع کی تکلیفیں اکیلے برداشت کرتی ہے۔ پھر بچے کی پرورش کا کام ماں باپ دونوں مل کر انجام دیتے ہیں۔ اس کا اشارہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَّ فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (لقمان: ۱۴)'' اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔'' اس آیت میں ماں باپ دونوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن مذکورہ تینوں امور میں ماں کا تذکرہ خصوصیت سے کیا گیا ہے۔

قرطبی نے لکھا ہے: مراد یہ ہے کہ ماں اپنے بیٹے کی جانب سے حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے اور حقوق کے ٹکراؤ کی صورت میں اس کا حق باپ کے حق پر مقدم ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: جمہور کہتے ہیں کہ حسنِ سلوک کے معاملے میں ماں کا درجہ باپ سے بڑھ کر ہے۔'' (فتح الباری، دار المعرفة، بیروت، ۱۰/ ۴۰۲)

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق خدمت، تابع داری اور اچھے برتاؤ سے ہے۔ اس کے ساتھ یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ گھر کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار باپ ہے اور دیگر افرادِ خانہ کو اس کا حکم ماننے کا پابند کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: ۳۴)

''مرد عورتوں پر قوام ہیں۔''

قوام اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت

میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ (ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سورۂ النساء حاشیہ: ۳۵) اس آیت میں 'مرد' سے مراد شوہر اور 'عورتوں' سے مراد بیویاں ہیں۔ اسلامی معاشرت میں نظامِ خاندان کے دائرے میں حکم و اختیار کا مالک شوہر ہے۔ بیوی بچوں کو اس کی مرضی ملحوظ رکھنی اور اس کے حکموں کی پابندی کرنی چاہیے۔ جن تہذیبوں اور معاشروں میں عورتوں کو بے لگام آزادی دے دی گئی ہے اور انھیں اپنی مرضی کا مالک بنا دیا گیا ہے، اسی طرح جن خاندانوں میں اقتدار کے دو مراکز بن جاتے ہیں، وہ انتشار، بے اطمینانی اور پراگندگی کا بدترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اسلامی نظامِ خاندان میں بیوی شوہر کی تابع دارِ محض اور محکوم نہیں، بل کہ مشیر کار ہوتی ہے۔ اس لیے بچوں کے سامنے ایسی صورت حال کم ہی پیش آتی ہے جب انھیں ماں باپ الگ الگ کاموں کا حکم دیں اور وہ اس مخمصے کا شکار ہوں کہ کس کا حکم مانیں، کس کا نہ مانیں؟ پھر بھی اگر کبھی وہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوں تو انھیں باپ کا حکم ماننا چاہیے، الا یہ کہ وہ کسی معصیت کا حکم دے، یا اس کی بات ماننا بدیہی طور پر نامناسب ہو۔ امام مالکؒ سے کسی نے دریافت کیا: میرا باپ مجھے بلاتا ہے، میری ماں مجھے روکتی ہے۔ میں کیا کروں؟ انھوں نے جواب دیا: ''اپنے باپ کا کہنا مانو اور اپنی ماں کی نافرمانی نہ کرو۔'' (فتح الباری، ۱۰/ ۴۰۲) یعنی باپ کے مقابلے میں ماں کسی بات کا حکم دے یا کسی چیز سے روکے تو اس کی بات نہ ماننا اس کی نافرمانی نہیں ہے۔

دھوکا اور طلاق

سوال: ایک صاحب کا نکاح ہوا۔ انھوں نے بیوی کو مہر کے علاوہ ایک مکان بھی بہ طور تحفہ دیا اور اس کی گفٹ رجسٹری اس کے نام کروادی۔ مگر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب اس بیوی سے ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ان کا دل پھر گیا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، بل کہ اسے اطلاع دیے بغیر تحفے میں دیے گئے مکان کی رجسٹری بھی منسوخ کروادی۔ اب وہ کہتے ہیں کہ کسی کو دیا گیا تحفہ واپس لیا جاسکتا ہے، شریعت میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔ بہ راہ کرم ہماری رہ نمائی فرمائیں۔ کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟

جواب: تحائف کے لین دین کو اسلام میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور اس عمل کو باہم محبت میں

اضافہ ہونے یا دلوں کا کینہ دور ہونے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ (بخاری فی الادب المفرد، بیہقی) اسی طرح احادیث میں کسی کو تحفہ دے کر واپس لینے کو ناجائز کہا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: 'کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی کو کوئی چیز تحفے میں دے کر واپس لے لے، ہاں باپ اپنے بیٹے کو دی ہوئی چیز واپس لے سکتا ہے، ایسا کرنے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو قے کر کے پھر اسی کو چاٹ لے' (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) اسی لیے جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی کو تحفہ دے کر اسے واپس لینا حرام ہے۔ خواہ یہ معاملہ بھائیوں کے درمیان ہو یا میاں بیوی کے درمیان۔ (فقہ السنۃ، سید سابق، بیروت، ۳/۵۵۱)

حدیث میں باپ کے لیے بیٹے کو دیے گئے تحفے کو واپس لینے کے جواز کی بات اپنے عموم پر نہیں ہے، بل کہ اس صورت میں ہے کہ کسی شخص کے کئی بیٹے ہوں، تو چوں کہ یہ ناانصافی ہے، اس لیے ایک بیٹے کو دیے گئے تحفے کو وہ واپس لے سکتا ہے۔ یہ وضاحت دیگر احادیث میں موجود ہے۔

صورتِ مسئولہ میں اور بھی کئی غلط کام کیے گئے ہیں:

۱- اولاد نہ ہونے کی بنا پر بیوی سے قطع تعلق کر لیا، حالاں کہ اولاد ہونا یا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے، اس میں بیوی کا کوئی قصور نہیں ہے۔

۲- بیوی کو طلاق مغلظہ دی، حالاں کہ یہ طلاق کا غیر مسنون طریقہ ہے۔

۳- بغیر اطلاع دیے (دھوکے سے) گفٹ رجسٹری کو منسوخ کروا دیا۔

متعلقہ فرد نے کئی ناجائز کاموں کا ارتکاب کیا ہے۔ انھیں اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔ تلافی کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ وہ سابقہ بیوی کو تحفے میں دیا گیا مکان واپس کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بوڑھوں کے لیے رفاہی اداروں کا قیام

سوال: آج کل بوڑھوں کے لیے 'اولڈ ایج ہومس' کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ تقریباً تمام بڑے شہروں میں یہ ادارے قائم ہیں۔ عموماً انھیں چلانے والے غیر مسلم ہیں۔ کیا شرعی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ایسے ہومس قائم کرنا جائز ہے؟

بہ راہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل اظہارِ خیال فرمائیں۔

جواب: موجودہ زمانے میں اولڈ ایج ہومس (Old Age Homes) سماج کی ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر ابھرے ہیں۔ مادیت کی دوڑ میں لوگ اس قدر مصروف ہیں کہ انھیں اپنے بزرگوں، رشتہ داروں اور متعلقین سے بات تک کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ بوڑھے ماں باپ کو ایک بوجھ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس صورتِ حال میں تنہائی، متعلقین کی لاپروائی اور دیگر اسباب کی بنا پر بوڑھے ان 'ہومس' کی شکل میں اپنے لیے گوشۂ عافیت تلاش کرلیتے ہیں۔ بعض شقی القلب اولادیں بھی اپنے عیش وآرام کو خلل سے بچانے کے لیے انھیں وہاں داخل کردیتی ہیں۔ ان مراکز میں بوڑھوں کی نگہ داشت، طبی جانچ، ٹیلی فون اور دیگر سہولیات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور بالکل گھر جیسا ماحول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، جہاں بوڑھے اپنوں سے جدائی کا غم دور کرسکیں۔ ان میں سے بعض سرکاری امداد یا غیر سرکاری تنظیموں کے مالی تعاون سے رضا کارانہ طور پر چلتے ہیں اور بعض اپنی خدمات کی فیس وصول کرتے ہیں جس کی ادائی یہ بوڑھے خود یا ان کی اولادیں کرتی ہیں۔

'اولڈ ایج ہومس' مغرب کی مادہ پرستانہ اور خودغرضی پر مبنی تہذیب کی پیداوار ہیں۔ ایسے ہومس مغربی ممالک میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ادھر کچھ عرصے سے ان کا چلن بڑھا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۵ء تک ملک میں ایک ہزار سے زیادہ اولڈ ایج ہومس قائم ہوچکے تھے۔

'اولڈ ایج ہومس' کا تصور اسلامی تہذیب وثقافت سے میل نہیں کھاتا، اس لیے مسلم تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کا چلن نہیں ہوا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے، ان کی خبر گیری کرنے، انھیں خوش رکھنے اور آرام پہنچانے اور ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے۔" (العنکبوت: ۸، لقمان: ۱۴، الاحقاف: ۱۵) بندوں کے حقوق میں خاص کر والدین کے حقوق کی ادائی کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اس کا تذکرہ اللہ کے حق سے متصل کیا گیا ہے۔ جہاں انسانوں کو یہ حکم

دیا گیا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اس کے معاً بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کریں (البقرۃ: ۸۳، النساء: ۳۶، الانعام: ۱۵۲) سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے ساتھ اچھے برتاؤ اور خاص طور پر بڑھاپے میں ان کے ساتھ حسنِ معاملہ کی تاکید بہت مؤثر اور دل کش انداز میں کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا یَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡہَرۡہُمَا وَ قُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا ○ وَ اخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ وَ قُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا ○ؕ

(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

”تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ: تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو۔ نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بل کہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔“

احادیث میں بھی بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے اور ان کا سہارا بننے کی تاکید کی گئی ہے اور ایسا کرنے والے کو جنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

رَغِمَ اَنۡفُہٗ، رَغِمَ اَنۡفُہٗ، رَغِمَ اَنۡفُہٗ۔ قِیۡلَ مَنۡ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: مَنۡ اَدۡرَکَ وَالِدَیۡہِ عِنۡدَ الۡکِبَرِ اَحَدُہُمَا اَوۡ کِلَیۡہِمَا ثُمَّ لَمۡ یَدۡخُلِ الۡجَنَّۃَ۔ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، حدیث: ۲۵۵۱)

”اس شخص کی ناک غبار آلود ہوئی، اس شخص کی ناک غبار آلود ہوئی، اس شخص کی ناک غبار آلود ہوئی، (یعنی وہ ناکام و نامراد ہوا) صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ،

کس شخص کی؟ فرمایا: جس نے اپنے والدین میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر بھی جنت میں داخل نہ ہوسکا۔''

یہی حدیث جامع ترمذی میں جن الفاظ میں مروی ہے وہ زیادہ صریح ہیں:

رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ اَدْرَكَ عِنْدَهُ اَبَوَاهُ (اَوْ اَحَدُهُمَا) الْكِبَرَ فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ۔ (جامع ترمذی، ابواب الدعوات، حدیث:۳۵۴۵)

''اس شخص کی ناک غبار آلود ہوئی جس کے پاس رہتے ہوئے اس کے ماں باپ میں سے دونوں یا کوئی ایک بوڑھے ہوئے، پھر بھی ان کے ذریعے وہ جنت میں داخل نہ ہوسکا۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: ''میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت و جہاد کے لیے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ذریعے میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا خواہاں ہوں۔''

آپؐ نے دریافت فرمایا: ''کیا تمھارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں، دونوں زندہ ہیں۔''

آپؐ نے پھر دریافت فرمایا: ''کیا تم واقعی اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب چاہتے ہو؟''

اس شخص نے جواب دیا: ''ہاں۔''

تب آپؐ نے فرمایا: ''پھر اپنے والدین کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ رہ کر حسن سلوک کرو۔'' (صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، حدیث:۲۵۴۹)

اس حدیث سے واضح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی بڑھ کر قرار دیا ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ عام حالات میں فرض کفایہ ہے، جب کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک فرض عین ہے۔

قرآن و حدیث کی ان تعلیمات کا تقاضا ہے کہ والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اولڈ ایج ہومس کے حوالے نہ کر دیا جائے، بل کہ انھیں اپنے ساتھ رکھا جائے، ان کی پوری طرح

خبر گیری کی جائے، ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جائیں، ان کی دل جوئی کی جائے۔ بڑھاپے کے چڑ چڑے پن کی وجہ سے اگر وہ کبھی سخت سست کہیں تو اس کا برا نہ مانا جائے۔ انھیں جھڑکا جائے نہ اف کہا جائے، بل کہ نرمی اور محبت سے پیش آیا جائے۔ مسلم معاشرہ عموماً ان تعلیمات پر عمل پیرا رہا ہے، اس لیے یہاں کبھی اولڈ ایج ہومس قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اولڈ ایج ہومس کا قیام شرعی اعتبار سے ناجائز ہے۔ بسا اوقات ایسے حالات ہو سکتے ہیں کہ کوئی مرد یا عورت بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے اور وہ لاولد ہو، یا اس کی اولاد ہو مگر اس سے بے پروا ہو، یا کسی اور سبب سے وہ بے سہارا ہو اور کوئی اس کی خبر گیری کرنے والا نہ ہو۔ ایسے لاچار و مجبور اور بے سہارا مردوں، عورتوں کے لیے رفاہی ادارے قائم کرنا کارِ ثواب ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔ (عبدالرؤف مناوی، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، ۳/۴۸۱)

''لوگوں میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس سے دوسرے انسانوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔''

اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھ لے؟

سوال: میں ایک سلاٹر ہاؤس میں کام کرتا ہوں۔ یہاں بڑے پیمانے پر جانوروں کا ذبیحہ ہوتا ہے۔ ذبح کا عمل صحیح اور شرعی طریقے سے انجام پائے اس کی نگرانی کے لیے دو مستند علماء مامور ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ٹرک سے جانوروں کو اتارتے وقت محسوس ہوا کہ ایک جانور بے دم ہو رہا ہے۔ جھٹ سے ایک مزدور نے اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔ البتہ چھری چلاتے وقت اس نے بسم اللہ، اللہ اکبر کہنے کی بہ جائے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا۔ خیال رہے کہ مزدور مسلمان تھا، لیکن ان پڑھ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ یہ ذبیحہ جائز ہوا یا نہیں؟ سلاٹر ہاؤس کے عالم صاحب سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے اسے ناجائز قرار دیا اور وجہ یہ بتائی کہ جانور ذبح کرتے

وقت صرف اللہ تعالیٰ کا نام لینا چاہیے۔ غیر اللہ کا نام لینے سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے۔ اس فتویٰ کے صحیح ہونے پر مجھے کچھ شبہ ہے۔ کیا کلمۂ طیبہ پڑھ کر ذبح کرنے سے جانور حرام ہو جائے گا؟ مزدور نے اسے اللہ کے رسول ﷺ کے نام سے تو نہیں ذبح کیا ہے؟

بہ راہِ کرم اس مسئلے پر قرآن و حدیث کی روشنی میں رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: قرآن کریم میں صراحت ہے کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس کا گوشت کھانا حلال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ٥ وَمَالَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام:۱۱۸، ۱۱۹)

”پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟“

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ

(الانعام:۱۲۱)

”اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت نہ کھاؤ۔ ایسا کرنا فسق ہے۔“

جانور کو ذبح کرتے وقت کیا الفاظ کہے جائیں، اس کا قرآن میں تذکرہ نہیں ہے۔ بس کہا گیا ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ البتہ بعض روایات میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں حضرت انسؓ ایک موقعے پر نبی ﷺ کے ذریعے دو مینڈھوں کی قربانی کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

ذَبَحَهَا بِيَدِهٖ وَ سَمّٰى وَ كَبَّرَ۔ (بخاری:۵۵۶۵)

”آپؐ نے انھیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔ اللہ کا نام لیا اور اس کی بڑائی بیان کی۔“

اسی طرح حضرت جابرؓ ایک قربانی کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میں ایک عید الاضحیٰ کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ نماز اور خطبے کے بعد ایک مینڈھا آپ کے پاس لایا گیا۔ آپؐ نے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔ فرمایا: 'بسم اللہ اللہ اکبر'۔" (ابوداؤد: ۲۸۱۰)

اسی سے فقہاء نے مسنون طریقہ یہ بتایا ہے کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر کہا جائے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے الفاظ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت اللہ یا صرف رحمٰن یا صرف رحیم کہے، یا اللہ اکبر کے بہ جائے اللہ اجل، اللہ الرحمٰن یا اللہ الرحیم کہے، یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے یا سبحان اللہ کہے یا لا الہ الا اللہ، کہے، یہ تمام صورتیں درست ہیں۔ اس لیے کہ اس سے قرآن کے حکم کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے، پر عمل ہو جاتا ہے۔

ذبیحے کے حلال ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر اللہ کے علاوہ اور کسی کا نام نہ لیا گیا ہو۔ قرآن میں جن حرام چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (المائدۃ:۳، النحل:۱۱۵)

"اور وہ جانور جسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔"

چناں چہ اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینے کے ساتھ کسی بزرگ، ولی یا پیغمبر کا نام بھی لیتا ہے تو ایسا ذبیحہ حرام ہوگا۔ مثلاً وہ کہے: بسم اللہ واسم محمد ﷺ (اللہ کے نام اسے اور محمدؐ کے نام سے) تو یہ ناجائز ہے اور ایسے ذبیحہ کا گوشت کھانا حرام ہے۔ لیکن سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ ذبح کرنے والے نے نادانی میں بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھنے کے بہ جائے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ پڑھا۔ گویا اس نے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا ہے۔ اس موقع پر محمد رسول اللہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہ اس نے یہ مراد لی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ کے نام سے جانور ذبح کر رہا ہے۔ اس لیے یہ ذبیحہ حلال ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں کہا گیا ہے:

"اگر ذبح کرنے والا کہے: بسم اللہ، محمد رسول اللہ تو ذبیحہ حلال ہے۔ اس لیے کہ اس نے دوسرے جملے کو پہلے جملے سے نہیں ملایا۔ اس لیے اس صورت میں شرک نہیں پایا گیا۔

لیکن ایسا کہنا مکروہ ہے، اس لیے کہ اس میں حرام صورت سے یک گونہ مشابہت ہو جاتی ہے۔'' (علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مطبعۃ الجمالیۃ مصر، ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء طبع اول، ۵/ ۴۸)

فقہ کی کتابوں میں ذبح کی شرائط اور آداب کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ سلاٹر ہاؤس کے ملازمین کو اس سلسلے کی موٹی موٹی باتیں ضرور بتا دینی چاہییں۔ اصولی طور سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شریعت میں عبادت، دعا اور ذکر وغیرہ کے مواقع پر توحید کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور ان میں تنہا اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کسی کو حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی شریک نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے ایسی صورتوں سے بچنا چاہیے، جن میں شرک کی بو آنے لگے اور توحید کا عقیدۂ صافی گدلا ہو جائے۔

ملکیت کا مسئلہ

سوال: یہاں کی ایک دینی تنظیم کا، ایک جگہ معمولی تعمیر شدہ دفتر تھا۔ دینی ذہن رکھنے والے ایک بلڈر نے پیش کش کی کہ وہ اپنے والد محترم کے ایصالِ ثواب کے لیے اپنے خرچ سے تنظیم کی عالی شان عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ تنظیم کے ذمہ داروں نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی اور اعتماد کی فضا میں اپنی زمین اور تعمیر شدہ معمولی عمارت ان کے حوالے کر دی، جسے توڑ کر اس زمین پر ازسرِ نو بلڈنگ کی تعمیر کا کام ہونے لگا۔ ساری باتیں زبانی ہوئیں، کوئی تحریری معاہدہ نہیں کیا گیا۔ تعمیر کے دوران ہی بلڈر نے بعض سیاسی و معاشی مصلحتوں کا حوالہ دے کر تنظیم کے ذمے دار سے ایک مشترکہ ایگریمنٹ پر دستخط کروا لیے، جس کی رو سے نئی تعمیر شدہ عمارت کی دو منزلیں تنظیم کی اور دو منزلیں بلڈر کی قرار پائیں۔ بلڈر نے اس موقع پر تنظیم کے ذمہ داروں کو اعتماد میں لیتے ہوئے صراحت سے کہا کہ یہ محض بعض قانونی ضوابط کی خانہ پری ہے، ورنہ پوری عمارت اصلاً تنظیم کی ملکیت ہوگی۔ لیکن عمارت کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اسے انھوں نے تنظیم کے حوالے نہیں کیا، بل کہ اس کی اوپری دو منزلیں اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے اس میں اپنا ذاتی دفتر قائم کر لیا، نیز اس میں ایک دینی پروجیکٹ شروع کر دیا۔ تنظیم کے ذمہ داروں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ پوری عمارت کی ملکیت تنظیم کی تسلیم کرتے ہوئے اسے تنظیم کے حوالے

کردیں، مگر انھوں نے انکار کردیا۔ مجبوراً تنظیم کے ذمہ داروں نے ان کے سامنے چار تجاویز رکھی ہیں: (۱) وہ غیر مشروط طور پر نئی تعمیر شدہ عمارت کو تنظیم کے حوالے کردیں۔ (۲) اگر وہ اس کا کچھ حصہ کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو تنظیم کے ذمہ داروں سے اس کی باضابطہ اجازت لے لیں۔ (۳) وہ بلڈنگ پر صرف شدہ رقم تنظیم سے لے کر پوری عمارت تنظیم کے حوالے کردیں۔ (۴) یا آخری چارۂ کار کے طور پر زمین کی رقم تنظیم کو لوٹا دیں۔

اس پس منظر میں آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل امور پر فتویٰ دے کر ہماری رہ نمائی فرمائیں:

(۱) تنظیم کے ذمہ داروں کو اعتماد میں لے کر اور اس کا غلط فائدہ اٹھا کر نئی تعمیر شدہ عمارت کی دو منزلیں اپنے نام سے رجسٹرڈ کروالینا اور اس پر اپنا دعویٰ کرنا کیا دھوکا نہیں ہے؟ شریعت میں دھوکا دینے والے کے لیے کیا وعید آئی ہے؟

(۲) بلڈر کبھی عمارت کے نصف حصے پر اپنا دعویٰ کرتے ہیں اور کبھی پوری عمارت پر تنظیم کی ملکیت تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کی حوالگی کے لیے مختلف شرائط عائد کرتے ہیں۔ حوالگی کے لیے شرائط کی فہرست دینا شریعت کی رُو سے کیا حیثیت رکھتا ہے؟

(۳) کسی کی عمارت پر بہ زور و جبر قبضہ جمائے رکھنا کیا شریعت کی رُو سے صحیح ہے؟

(۴) بلڈر قانونی پیپرس کا حوالے دے کر عمارت کی دو منزلوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ کیا وہ غاصب اور ظالم نہیں ہیں؟ کیا غاصب و ظالم کے دباؤ میں آکر اس کی کوئی تجویز قبول کرلینا صحیح ہے؟ کیا یہ ظلم کا ساتھ دینا نہیں ہوا؟

(۵) تنظیم کے ذمہ داروں کے لیے کیا رویہ صحیح ہے؟ وہ حکمت کے ساتھ ظلم کا مقابلہ کریں یا مذکورہ بلڈر سے رقم لے کر معاملہ رفع دفع کرلیں؟

جواب: سب سے پہلے تو میں یہ عرض کردوں کہ میں کوئی رجسٹرڈ/ سند یافتہ مفتی نہیں ہوں، اس لیے میرے اس جواب کی حیثیت فتوے کی نہیں ہے۔ میں محض اسلامیات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ صورتِ مسئلہ کا جو جواب روحِ دین اور احکامِ شریعت کی روشنی میں میری سمجھ میں آیا ہے اسے ذیل میں تحریر کر رہا ہوں:

(۱) دینی تنظیم اور مقامی بلڈر نے باہمی اعتماد کی فضا میں تنظیم کی عمارت کی ازسرِ نوتعمیر کا آغاز کیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد باہمی اعتماد کے شفاف آئینہ میں لکیر پڑگئی۔ فریقین کو غور کرنا چاہیے کہ ان سے غلطی کہاں ہوئی؟ بلڈر نے یہ کام ان کے بہ قول اپنے مرحوم والد کے ایصال ثواب کے لیے کیا تھا۔ ان کا یہ کام بڑا مبارک ہے۔ بچوں کے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد صدقۂ جاریہ کا کوئی ایسا کام کردیں، جس کا ثواب ان کو برابر پہنچتا رہے۔ حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ لیکن بعد میں انھوں نے جو رویہ اختیار کیا، انھیں سوچنا چاہیے کہ اگر ان کے والد مرحوم زندہ ہوتے تو کیا وہ خود ایسا رویہ اختیار کرتے؟ یا اپنے صاحب زادگان کو یہ رویہ اختیار کرتے ہوئے دیکھتے تو کیا وہ خوش ہوتے؟ کسی تنظیم سے وابستگی اجتماعیت کی روح پروان چڑھاتی ہے۔ اس میں اجتماعی مفاد پر انفرادی مفاد کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ صدقۂ جاریہ کے نام پر کوئی ایسا کام کرنا یا ایسا رویہ اختیار کرنا جس سے اس مرحوم شخصیت کی روح کو، جس کے ایصالِ ثواب کے لیے وہ کام انجام دیا گیا ہے، تکلیف پہنچے، میں اسے کوئی کارِ خیر نہیں سمجھتا۔ تنظیم کی غلطی یہ ہے کہ اسے ابتدا ہی سے تمام معاملات تحریری شکل میں طے کرنے چاہیے تھے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو بعد میں رونما ہونے والے اختلافات کو خوش اسلوبی سے حل کیا جاسکتا تھا۔ عموماً دینی حلقوں میں اس معاملے میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔ شروع میں معاملات اعتماد کی فضا میں زبانی طے کیے جاتے ہیں، بعد میں اختلاف ہونے کی صورت میں فریقین کے بیانات میں تضاد ہوتا ہے اور معاملہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم کی سب سے طویل آیت (البقرۃ: ۲۸۲) جسے آیتِ مداینہ کہا جاتا ہے، اس میں قرض کے لین دین کے معاملے کو ضبطِ تحریر میں لانے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک ایسے سماج میں، جہاں لکھنا جاننے والوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا، معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا اتنا تاکیدی حکم کیوں دیا گیا؟

(۲) آپ نے لکھا ہے کہ بلڈر تعمیر شدہ عمارت کی بالائی دو منزلوں میں سے ایک میں قرآن کے نام سے ایک دینی پروجیکٹ چلا رہے ہیں۔ یہ بڑا مبارک کام ہے۔ اللہ تعالیٰ

اسے فروغ دے اور اس کے ذریعے گم کردہ راہ انسانوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے معاملات میں شفافیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپ نے لکھا ہے کہ ابتدا میں انھوں نے اپنے والد مرحوم کے ایصال ثواب کی خاطر اپنے خرچ پر تنظیم کے لیے عمارت تعمیر کرنے کی پیش کش کی، مگر بعد میں انھوں نے تنظیم کے ذمہ داروں کو دھوکے میں رکھ کر ایک مشترکہ ایگریمنٹ کرالیا اور اب وہ کبھی تعمیر شدہ عمارت کی مشترکہ ملکیت کی بات کہتے ہیں، کبھی تنظیم کی ملکیت تو تسلیم کرتے ہیں، مگر تنظیم کو اس کی حوالگی کے لیے مختلف شرائط عائد کرتے ہیں۔ یہ رویہ قرآن کا پیغام عام کرنے کے مشن کے علم بردار کسی شخص کو زیب نہیں دیتا۔ آدمی کی زبان ہر وقت قرآن کے ذکر اور پیغام کی تبلیغ میں منہمک ہو، لیکن اس کا کردار قرآن کی تعلیمات کی دھجیاں اڑاتا ہو، یہ رویہ کسی حقیقی اور باشعور مسلمان کا نہیں ہوسکتا۔ لیکن افسوس کہ ایسے کردار کے لوگ پائے جاتے ہیں اور آج ہی نہیں، ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے لوگوں کی پیش گوئی فرمائی تھی: ''کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح باہر ہو جائیں گے جس طرح تیر شکار کے اندر سے ہوکر باہر نکل جاتا ہے۔'' (بخاری: ۳۳۴۴، ودیگر مقامات)

احادیث میں دھوکے کی شدید الفاظ میں مذمت آئی ہے۔ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (مسلم: ۱۰۱) ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''دھوکا دہی کا انجام جہنم ہے۔'' (بخاری، کتاب البیوع، باب النجش) ہم میں سے ہر شخص کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ اس چند روزہ زندگی میں وہ دوسرے کو دھوکہ دے کر کچھ مال حاصل کرسکتا یا کسی جائیداد پر قابض ہوسکتا ہے، مگر میدان حشر میں بارگاہِ رب العزت کے روبرو جب اس کے اعضا اس کے خلاف گواہی دیں گے تو وہاں اس کے لیے حسرت وندامت ہوگی اور اس وقت کی ندامت اس کے کچھ کام نہ آئے گی۔

(۳) آپ نے لکھا ہے کہ تنازع کو حل کرنے کے لیے تنظیم کے ذمے داروں نے بلڈر کے

سامنے چار تجاویز رکھی ہیں:

(الف) وہ غیر مشروط طور پر بلڈنگ تنظیم کے حوالے کر دیں۔

(ب) بلڈنگ پر تنظیم کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے اپنا پروجیکٹ چلانے کے لیے ذمہ دارانِ تنظیم سے تحریری اجازت لیں۔

(ج) بلڈنگ پر صرف شدہ رقم تنظیم سے لے کر بلڈنگ اس کے حوالے کر دیں۔

(د) زمین کی رقم تنظیم کو لوٹا دیں۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو چوتھی تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ بلڈر نے دھوکا دے کر عمارت کی دو منزلیں اپنے نام رجسٹرڈ کروالی ہیں، وہ غاصب اور ظالم ہیں، زمین کی رقم لے کر پوری عمارت کو ان کے حوالے کر دینا ظلم کا ساتھ دینا ہے۔ اس لیے ان سے رقم لے کر معاملے کو ختم کرنے کے بہ جائے حکمت کے ساتھ آخر دم تک ظلم کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ذمہ دارانِ تنظیم نے مذکورہ تجاویز پیش کر کے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ اگر ابتدائی دو تجاویز فریقِ مخالف کے نزدیک اس کے ظلم و جبر اور دھاندلی کی بنا پر درخورِ اعتنا نہیں ہیں تو آخری دو تجاویز میں سے کسی ایک پر باہم متفق ہو کر معاملہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ذمہ داران مصالحِ تنظیم کو پیشِ نظر رکھ کر جس تجویز کو اس کے حق میں بہتر سمجھیں، اختیار کر لیں۔ صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس موقعے پر کفارِ قریش کی طرف سے جو شرائط پیش کی گئی تھیں وہ سراسر ظالمانہ اور ایک طرفہ تھیں۔ اسی بنا پر بہت سے جلیل القدر صحابہ ان پر کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے۔ مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو قبول کرنے میں مصلحت سمجھی تو انھی پر معاہدہ کر لیا۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی اور مشرکین کو چیلنج کیا کہ جو شخص بھی اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنانا چاہتا ہے، وہ مجھے روک کر دیکھے اور اللہ کے رسول ﷺ نے خفیہ طور پر چھپ چھپا کر ہجرت فرمائی۔ حضرت عمرؓ کا عمل بھی صحیح تھا اور اللہ کے رسول ﷺ کا عمل بھی غلط نہ تھا۔ بل کہ آپ کے اس اسوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر موقع پر عزیمت، جرأت اور جواں مردی کا مظاہرہ کرنا مطلوب نہیں ہے، بل کہ بسا اوقات بہ ظاہر دب کر معاملات سلجھا لینا ہی حکمت و مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں چوتھی تجویز کے حق میں ہوں۔ میرا

کہنا بس یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی دونوں تجویزیں قابلِ اختیار ہیں۔ ذمہ دارانِ تنظیم رفقا کے مشورے سے اور مصالحِ تنظیم کو پیشِ نظر رکھ کر کسی کو بھی قبول کر سکتے ہیں۔ البتہ میرے نزدیک تنظیم کی قانونی پوزیشن کم زور ہے۔ مشترکہ ایگریمنٹ پر ذمہ دارِ تنظیم نے بھی دستخط کیے ہیں۔ اگر فریقِ مخالف کی نیت میں فتور تھا اور اس نے غلط بیانی اور فریب دہی کے ساتھ اس ایگریمنٹ پر دستخط کروائے ہیں تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہ روزِ قیامت اس سے نمٹ لے گا۔ لیکن دنیا میں معاملات کا فیصلہ نیت پر نہیں، بل کہ ظاہر اعمال پر ہوتا ہے۔

ہر مسلمان کو یہ حقیقت ہر لمحہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ دنیوی زندگی چند روزہ ہے۔ یہاں وہ جو کچھ اچھا یا برا کام کرے گا اس کا انعام یا انجام آخرت میں پائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ”جس شخص نے کسی کی ایک بالشت زمین پر ناحق قبضہ کیا، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس طرح کی سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں ڈال دے گا۔“ (بخاری: ۳۱۹۸، مسلم: ۱۶۱۰)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

حقِ وراثت حاصل کرنے کے لیے لڑائی جھگڑا کرنا

سوال: میرے والد کا عرصہ قبل انتقال ہو گیا ہے۔ بڑے بھائیوں نے صریح ناانصافی کرتے ہوئے تجارت میں سے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کو محروم کر دیا ہے۔ وہ موروثہ جائیداد کو تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔ کسی کی ثالثی بھی انھیں منظور نہیں۔ عدالتوں میں کارروائی کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے خاصے مصارف کی ضرورت ہوتی ہے اور دیگر مسائل بھی ہوتے ہیں۔ پھر عدالت ہر بات کا ثبوت چاہتی ہے۔ یہ سوچ کر ہم نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تھا اور علیٰحدہ زندگی گزارنی شروع کر دی تھی۔ مگر حال میں ایک صاحب نے کہا کہ اپنا حق لڑ کر لینے کا حکم ہے، ورنہ آپ گنہ گار ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے اور ہوا بھی یہی ہے کہ جب جب ہم نے حق مانگا ہے، بات لڑائی جھگڑے اور خون خرابے تک پہنچ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ برائے مہربانی شرعی طریقہ بتائیں۔ کیا خون خرابہ کر کے حق حاصل کرنا صحیح ہو گا؟

جواب: اسلامی شریعت کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کے مرنے کے بعد اس کے متروکہ مال و جائیداد کو اس کے پس ماندگان میں تقسیم کیے جانے کا قانون وضع کیا ہے۔ اسے قانونِ میراث کہتے ہیں۔ اس معاملے میں اس نے مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی اور مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی اس کا مستحق قرار دیا۔ قرآن میں ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا۝ (النساء:۷)

''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔''

اس آیت سے چند باتیں بہت واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں:

(۱) میراث کے مستحق مرد اور عورت دونوں ہیں۔ قرآن نے جن لوگوں کا حصہ متعین کیا ہے ان میں سے کسی کو محروم کرنا جائز نہیں۔

(۲) میت نے جو کچھ چھوڑا ہے سب قابلِ تقسیم ہے، خواہ وہ منقولہ جائیداد ہو یا غیر منقولہ، مکان ہو یا دوکان، زمین ہو یا مالِ تجارت۔

(۳) مالِ میراث کو ہر حال میں تقسیم کیا جائے، خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

(۴) مستحقینِ میراث کے حصے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ہر وارث کو لازماً اس کا حصہ ملنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرض ہے۔ جس طرح دیگر فرائض کی عدم ادائی موجبِ گناہ ہے اسی طرح مالِ میراث کو تقسیم نہ کرنا یا کسی مستحق کو اس سے محروم کرنا بھی گناہ ہے۔

افسوس کہ مسلم معاشرہ اس معاملے میں مجرمانہ غفلت کا شکار ہے۔ زیادہ سے زیادہ میت کی نرینہ اولاد میں میراث تقسیم ہو جاتی ہے اور عورتوں کو کچھ بھی حصہ نہیں ملتا۔ جو لوگ اس

حق تلفی کے ذمہ دار ہیں انھیں خبردار ہو جانا چاہیے کہ بارگاہِ الٰہی میں ان سے اس معاملے کی جواب دہی ہوگی اور انھوں نے اہلِ حق کا جو حق مارا ہوگا اس کی سزا سے وہ بچ نہ سکیں گے۔ حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ۔ (بخاری: ۳۱۹۸ مسلم: ۴۱۳۵)

''جس شخص نے ایک بالشت بھر زمین بھی ناحق لے لی، قیامت کے دن اس کی گردن میں ویسی سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔''

اگر کسی شخص کو میراث میں اس کے حق سے محروم کر دیا جائے تو وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کر سکتا ہے۔ قریبی رشتہ داروں کو معاملے کے حل کے لیے واسطہ بنا سکتا ہے۔ قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ دیگر ذرائع اپنا سکتا ہے۔ یہ اس کا حق ہے۔ جو شخص ایسا کرے وہ کسی بھی طور پر قابلِ ملامت نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو اندیشہ ہو کہ اپنا حق مانگنے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش میں بات لڑائی جھگڑے بل کہ اس سے آگے بڑھ کر خون خرابے تک پہنچ جائے گی اور وہ اس سے بچنے کے لیے خاموشی اختیار کر لے اور اس معاملے کو اللہ کے حوالے کر دے تو اس کا یہ رویہ پسندیدہ ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں ضرور وہ اس پر اجر کا مستحق ہوگا۔ سورۂ الشوریٰ میں اہلِ ایمان کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں یہ اوصاف بھی ہیں:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ۝ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۝ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ۝ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ (الشوریٰ: ۳۹-۴۳)

''اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔

اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔''

ان آیات میں دونوں پہلوؤں کا واضح بیان ہے۔ زیادتی کا مقابلہ کرنے اور ظلم کا بدلہ لینے کا انسان کو حق حاصل ہے۔ لیکن اگر وہ صبر اور عفو و درگزر سے کام لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو بارگاہِ الٰہی میں اس کا بھرپور اجر پائے گا۔ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ یعنی اس کے معاف کرنے کا مقصد انتشار و فساد، لڑائی جھگڑا اور خون خرابے سے بچنا ہو۔ یہ حکم انفرادی معاملات سے متعلق ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے آیتِ مذکور کی تفسیر میں لکھا ہے: ''اس سے معلوم ہوا کہ عام انفرادی واقعات میں زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو اصلاح ہی کا طریقہ ہے۔ خواہ دونوں فریق خود باہم دگر اصلاح و تلافی کی کوشش کریں، یا دوسروں کو اس کا ذریعہ بنائیں، یا دوسرے از خود بیچ میں پڑ کر مصالحت کرادیں۔''

(تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۶/۱۸۱-۱۸۲)

میراث کے چند مسائل

سوال: میرے شوہر کا انتقال دو سال قبل ہو گیا ہے۔ میں ایک گرلز اسکول کی پرنسپل شپ سے وظیفہ یافتہ ہوں۔ کچھ جائیداد میرے شوہر کی موروثی ہے، کچھ ان کی خریدی ہوئی ہے اور کچھ جائیداد میں نے اپنی آمدنی سے بنائی ہے۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے، دوسرے رشتہ دار ہیں۔ میں ان تمام جائیدادوں کو شرعی اعتبار سے تقسیم کرنا چاہتی ہوں۔ بہ راہ کرم رہ نمائی فرمائیں۔

(۱) میرے خسر صاحب اور ساس صاحبہ کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ چند ایکڑ زرعی زمین ان کے ورثہ میں تھی۔ خسر صاحب کے انتقال کے وقت ان کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے میرے شوہر کا حال میں انتقال ہو گیا ہے۔ اس جائیداد میں میرے شوہر کا یا میرا کیا شرعی حق بنتا ہے؟

(۲) میرے شوہر نے ایک مکان ہاؤسنگ بورڈ سے قسطوں پر خریدا تھا۔ ابھی تقریباً ایک

لاکھ روپے ہاؤسنگ بورڈ کو اور ادا کرنا ہے۔ انتقال کے وقت ان کے اکاؤنٹ میں تیرہ ہزار روپے تھے۔ ان کے تین بھائی اور پانچ بہنیں حیات ہیں۔ اس مکان کو فروخت کرکے اس کی شرعی تقسیم کس طرح کی جائے؟

(۳) اپنے والدین سے وراثت میں مجھے چند ایکڑ زرعی زمین ملی ہے۔ اس کے علاوہ میری آمدنی سے بنایا گیا مکان اور کچھ پلاٹ ہیں۔ میری جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ میری حیات کے بعد کا ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ مستقبل میں کوئی مسئلہ یا نزاع میرے میکے اور سسرال والوں کے درمیان نہ ہو۔ فی الوقت میرے تین بھائی اور دو بہنیں حیات ہیں۔ دو بہنوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بچے موجود ہیں۔ بہ راہ کرم رہ نمائی فرمائیں:

(الف) مجھ جو زرعی زمین اپنے والدین سے ملی ہے کیا وہ پوری زمین ان کے ایصال ثواب کے لیے صدقہ کرسکتی ہوں؟ فی الوقت اسے بیچنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ میری بہنوں کی زمین بھی مشترک ہے۔ کیا اس کے لیے وصیت کی جاسکتی ہے؟

(ب) میں اپنی کل جائیداد میں سے کتنا حصہ اللہ کی راہ میں دے سکتی ہوں؟

(ج) کیا میں اپنی جائیداد ثواب جاریہ کے لیے یا رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرسکتی ہوں؟

جواب: معاشرتی زندگی سے متعلق قرآن کریم میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ تفصیل اور تاکید کے ساتھ میراث کے احکام مذکور ہیں۔ میراث کے حصے متعین کرنے کے بعد انھیں 'نَصِیبًا مَفرُوضًا' (اللہ تعالیٰ کی جانب سے متعین کردہ حصہ) 'فَرِیضَةً مِنَ اللّٰہِ' (اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرض) اور 'وَصِیَّةً مِنَ اللّٰہِ' (اللہ کی جانب سے مؤکد) قرار دیا گیا ہے (النساء: ۷، ۱۱، ۱۲) لیکن افسوس کہ معاشرے میں صحیح انداز سے میراث کی تقسیم کا چلن نہیں ہے۔ آپ قابل مبارک باد ہیں کہ آپ کو اس حکم الٰہی کی اہمیت کا احساس ہے اور اپنے مرحوم شوہر کی میراث اور مملوکہ جائیداد کو شرعی اعتبار سے تقسیم کرنا چاہتی ہیں اور اپنی جائیداد کی بھی مناسب تقسیم کے لیے فکر مند ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) آپ کے خسر صاحب کی وفات کے وقت ان کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں حیات تھے۔ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد ان لوگوں کے درمیان قرآنی اصول لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْن (ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر) کے مطابق تقسیم ہونی چاہیے۔ مذکورہ جائیداد کے پندرہ حصے کیے جائیں۔ ہر لڑکی کو ایک حصہ اور ہر لڑکے کو دو حصے کے اعتبار سے دیا جائے۔اس جائیداد میں سے آپ کے شوہر کا جو حصہ بنتا ہے (پندرہ حصوں میں سے دو حصے) وہ ان کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔

(۲) میراث کی تقسیم قرض کی ادائی کے بعد عمل میں لائی جاتی ہے۔آپ کے شوہر کے خریدے ہوئے مکان کی قیمت میں سے ابھی ایک لاکھ روپے کی قسطیں ادا کی جانی ہیں۔اس مکان کو فروخت کر کے اس میں سے ایک لاکھ روپے منہا کر دیے جائیں۔ بقیہ رقم میں ان کے اکاؤنٹ میں موجود روپے (تیرہ ہزار) شامل کر کے اسے وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے۔آپ کے شوہر کے متعلقین میں آپ (بیوی) کے علاوہ تین بھائی اور پانچ بہنیں زندہ ہیں۔قرآنی حکم کے مطابق اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کا حصہ ایک چوتھائی اور اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ ہے۔ (النساء:۱۲)اس اعتبار سے آپ کے شوہر کی میراث میں آپ کا حصہ ایک چوتھائی ہے۔ بقیہ (تین حصوں کی) میراث ان کے بھائی بہنوں کے درمیان (جو اصطلاح فقہ میں 'عصبہ' کہلاتے ہیں) اس طرح تقسیم ہوگی کہ ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ بہ الفاظ دیگر بقیہ میراث کے گیارہ حصے کیے جائیں۔ ہر بہن کو ایک حصہ اور ہر بھائی کو دو حصے دیے جائیں۔

(۳) آپ جس جائیداد کی مالک ہیں، خواہ وہ آپ کو میراث میں ملی ہو، یا آپ نے اپنی کمائی سے حاصل کی ہو، اس میں آپ اپنی صواب دید پر جس طرح چاہیں تصرف کر سکتی ہیں۔البتہ اس معاملے میں چند باتیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

(الف) تقسیم میراث کا مسئلہ وفات کے بعد سے متعلق ہوتا ہے۔کسی جائیداد کا مالک اپنی حیات میں اس میں سے جتنا چاہے، جس کو چاہے، دے سکتا ہے۔

(ب) اپنی جائیداد کسی دوسرے کو دینے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اپنی زندگی میں کسی کو اس کا مالک بنا دے۔ اسے ہبہ کہتے ہیں۔ یا یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد میری فلاں جائیداد فلاں شخص کی ہوگی۔ یہ وصیت کہلاتی ہے۔ ہبہ کی کوئی مقدار متعین نہیں۔ آدمی جتنا چاہے کسی کو ہبہ کر سکتا ہے۔ لیکن وصیت اپنی جائیداد میں سے ایک تہائی سے زیادہ کرنا جائز نہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے پورے مال کی وصیت کرنی چاہی تو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں اس سے منع فرما دیا۔ انھوں نے دریافت کیا: کیا نصف مال کی وصیت کر دوں؟ آپؐ نے اس سے بھی منع فرما دیا۔ انھوں نے پھر عرض کیا: تو ایک تہائی مال کی؟ آپؐ نے فرمایا: الثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ۔ ہاں ایک تہائی ٹھیک ہے اور یہ بہت ہے۔ (بخاری: ۲۷۴۴، مسلم: ۱۶۲۸)

(ج) ورثہ میں سے کسی کے حق میں وصیت کرنی جائز نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعْطٰى لِكُلِّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ، فَلاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔

(ترمذی: ۲۱۲۰)

”اللہ نے ہر صاحب حق کا حق بیان کر دیا ہے۔ اس لیے کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔“

(د) ورثہ کو محروم کرنے کے مقصد سے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد ٹھکانے لگا دینا جائز نہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے جب اپنے پورے مال کی وصیت کرنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے انھیں ایک تہائی سے زائد وصیت کرنے کی اجازت نہیں دی اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا:

اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ۔ (بخاری: ۱۲۹۵، مسلم: ۱۶۲۸)

”تم اپنے ورثہ کو مال دار چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں غربت کی حالت میں چھوڑ و اور وہ در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔“

مردوں کے لیے عورتوں سے علمی استفادہ؟

سوال: (۱) کیا کوئی عورت مردوں کے سامنے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پردے کی حالت میں تقریر کر سکتی ہے؟

(۲) کیا کسی مسلم خاتون اسکالر کی تقاریر، دروسِ قرآن وحدیث وغیرہ انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے، کسی مرد کے لیے سننا جائز ہے؟

بہ راہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب سے نوازیں۔

جواب: اجنبی مردوں اور عورتوں کے درمیان روابط کے کیا حدود ہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے سماج میں بہت زیادہ افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو ان کے درمیان کسی قسم کے رابطے کی اجازت نہیں دیتے، حتی کہ اجنبی مردوں کے سامنے عورتوں کی پرچھائیں بھی دکھائی دینے کے روادار نہیں ہیں، جب کہ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو ان کے درمیان کسی روک ٹوک کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سطح پر ان کے درمیان خلا ملا ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں رویے انتہا پسندی کے مظہر ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شاہ راہِ اعتدال ان کے درمیان ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اجنبی مرد اور عورت ایک دوسرے سے اپنی نگاہیں بچا کر رکھیں۔ احکام حجاب کی پاس داری کریں اور تنہائی میں نہ ملیں۔ البتہ اختلاط سے بچتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی باتیں سن سکتے ہیں۔ عورتوں کی آواز میں فطری طور پر ملائمت، کھنک اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے انھیں خاص طور پر حکم دیا گیا ہے کہ اجنبی مردوں سے بات کرتے ہوئے اپنی آواز میں لوچ پیدا نہ کریں اور صاف، سیدھے اور سپاٹ انداز میں بات کریں۔ ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ (الاحزاب: ۳۲)

''اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم پرہیز گار رہنا چاہتی ہو تو

(کسی اجنبی شخص سے) نرم نرم باتیں نہ کرو، تاکہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہے کوئی امید (نہ) پیدا کرے، اور دستور کے مطابق بات کیا کرو۔''

اس آیت کے ضمن میں مفسرین کی بعض تشریحات ملاحظہ ہوں:

(۱) آیت کے ٹکڑے اِنِ اتَّقَیْتُنَّ کا تعلق ماقبل سے بھی ہوسکتا ہے اور مابعد سے بھی۔ ماقبل سے متعلق ہونے کی صورت میں اس کا مطلب ہوگا ''اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، بل کہ ان سے افضل ہو۔'' اور مابعد سے تعلق کی صورت میں اس کا ترجمہ ہوگا ''اگر تم تقویٰ اختیار کرنا چاہتی ہو تو دوسروں سے نرم زبان میں بات نہ کرو۔'' (فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، المکتبة التوفیقیة، قاهره، ۱۸۲/۱۳، ابو حیان الاندلسی: البحر المحیط، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۲۰۰۲ء، ۲۰۳/۷)

(۲) اِتَّقٰی کے ایک معنی سامنا کرنے، استقبال کرنے، ملاقات کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ معنی بھی مراد ہوسکتے ہیں۔ یعنی اجنبیوں کا سامنا ہو تو ان سے آواز میں لوچ پیدا کیے بغیر بات کرو۔ یہ معنیٰ لغت میں معروف ہے۔ (اتّقیٰ بمعنی استقبل معروف فی اللغة، البحر المحیط، ۲۰۳/۷)

(۳) آیت میں اس انداز سے بات کرنے کی ممانعت ہے جس سے بیمار ذہنیت کے لوگوں میں برا جذبہ ابھرے۔ یہ انداز اس زمانے میں فاحشہ اور بدکار عورتیں اختیار کرتی تھیں۔ (زمخشری، الکشاف، طبع مصر، ۱۹۷۲ء، ۲۶۰/۳، تفسیر قرطبی، ۱۷۷/۱۴)

(۴) معروف طریقے کے مطابق بات کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ 'معروف قول' سے مراد وہ باتیں ہیں جو نہ شرعی طور پر ناپسندیدہ ہوں اور نہ عقلی طور پر (و هو الذی لا تنکره الشریعة ولا العقول۔ البحر المحیط، ۲۰۳/۷، تفسیر قرطبی، ۱۷۸/۱۴)

(۵) اس آیت میں جو آداب بیان کیے گئے ہیں ان کا خطاب اگرچہ نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات سے ہے، لیکن تبعاً امت کی عورتیں بھی ان کی مخاطب ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر، طبع دیوبند ۶۳۱/۳)

ان ہدایات کے مطابق عہد نبوی میں اور آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی

ازواجِ مطہرات اور دیگر صحابیات کی معمول کی سرگرمیاں جاری رہیں اور ان سے بے شمار مردوں نے دین کی باتیں سیکھی ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ اسماء بنت زید بن سکنؓ نامی ایک خاتون، جو حضرت معاذ بن جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس وقت آپؐ ایک مجلس میں صحابہ کرامؓ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ انھوں نے پہنچ کر عرض کیا: ”میں مسلمان خواتین کی ایک جماعت کی طرف سے، جو میرے پیچھے ہے، قاصد بن کر آئی ہوں۔ سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں کہتی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں جو میری ہے۔ اللہ نے آپؐ کو مردوں اور عورتوں، دونوں کی طرف بھیجا ہے۔ ہم سب آپ پر ایمان لائے اور آپ کی پیروی کی، لیکن ہم طبقۂ خواتین کا یہ حال ہے کہ وہ پابند، پردہ نشین، گھر میں بیٹھی رہنے والی، مردوں کی خواہشات کی مرکز اور ان کی اولاد کو اٹھانے والی ہیں اور مردوں کو جمعوں میں شرکت اور جنازوں اور جہاد میں حصہ لینے کی بنا پر فضیلت دی گئی ہے۔ جب وہ جہاد پر جاتے ہیں تو ہم ان کے مال و اسباب کی حفاظت اور ان کے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ تو کیا اے اللہ کے رسول! اجر و ثواب میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوں گی؟ حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف اپنا رخ کیا اور پوچھا: کیا تم نے کسی عورت کو اپنے دین کے متعلق اس عورت سے زیادہ بہتر انداز میں سوال کرتے سنا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! نہیں۔“ (ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، علی هامش الاصابة لابن حجر، مطبعة السعادة مصر، ۴/۷ ۲۳-۲۳۸)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس نبوی میں موجود صحابہ کرام مذکورہ خاتون کو دیکھ بھی رہے تھے اور ان کی گفتگو سن بھی رہے تھے۔

بعض فقہائے کرام عورت کی آواز کے پردے کے بھی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اسے اجنبی مردوں سے اپنی آواز چھپانی چاہیے۔ لیکن قرآن و سنت کے مذکورہ بیان کی روشنی میں یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ الموسوعۃ میں ہے:

اَمَّا صَوۡتُ الۡمَرۡاَةِ فَلَیۡسَ بِعَوۡرَةٍ عِنۡدَ الشَّافِعِیَّةِ، وَ یَجُوۡزُ الۡاِسۡتِمَاعُ اِلَیۡهِ عِنۡدَ اَمۡنِ الۡفِتۡنَةِ۔

(الموسوعة الفقهية طبع کویت، ۴۷/۳۱، بہ حوالہ مغنی المحتاج، ۱۲۹/۳)

''رہی عورت کی آواز تو شوافع کے نزدیک اسے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو اسے سنا جا سکتا ہے۔''

استاذ گرامی محترم مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند سے ایک موقع پر سوال کیا گیا کہ کیا عورت کے لیے آواز کا بھی پردہ ہے یا نہیں؟ اس کا انھوں نے یہ جواب دیا:

''عورت کے لیے اجنبی مردوں سے بلاوجہ بات چیت کرنا، ناپسندیدہ ہے، لیکن بہت سی علمی، دینی، معاشی ضروریات کے تحت اسے بات چیت کرنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ کسی نامحرم سے بات چیت کے وقت عورت کی آواز میں لوچ نہ ہو۔ اس کی آواز ایسی نہ ہو کہ غیر مرد کے دل میں کوئی برا خیال آئے۔ بل کہ اس کے لب و لہجے میں کسی قدر درشتی ہو اور بات نیکی، تقویٰ اور دین و دنیا کی بھلائی کی ہو۔ ان ہدایات کو پیشِ نظر رکھ کر عورت اجنبیوں سے بات کر سکتی ہے۔''

(اسلام کا عائلی نظام، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۸۱)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر کوئی عورت کسی دینی موضوع پر تقریر کرے یا قرآن، حدیث کا درس دے اور اس پروگرام کی ویڈیوگرافی کر لی جائے تو مردوں کے لیے اس کی تقریر سننا اور اس کی ویڈیو دیکھنا جائز ہے۔

تحریکی خواتین کا دائرۂ عمل

سوال: میں الحمد للہ جماعت اسلامی ہند کی رکن ہوں، دس سال سے زیادہ عرصے سے جماعت سے وابستہ ہوں اور اس کی سرگرمیوں میں حسب توفیق حصہ لیتی ہوں۔ لیکن پچھلے کچھ وقت سے میں ایک الجھن میں مبتلا ہوں۔ میری الجھن خواتین کے دائرۂ عمل سے متعلق ہے۔ میں کچھ سوالات آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں میری رہ نمائی کر کے الجھن دور فرمائیں۔

۱- جماعت کے بڑے اجتماعات میں، جو علاقے، حلقے یا مرکز کی سطح پر منعقد ہوتے ہیں، مردوں کے ساتھ خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ کیا ایسے مشترک اجتماعات میں کوئی عورت درسِ قرآن یا درسِ حدیث دے سکتی ہے، تقریر کر سکتی ہے یا مذاکرے میں

حصہ لے سکتی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ نماز باجماعت میں اگر امام سے کوئی غلطی ہو جائے اور اس کو متنبہ کرنا ہو تو مردوں کو سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ صرف دستک دیں، زبان سے کچھ نہ بولیں۔ جب نماز جیسی عبادت میں عورتوں کا آواز نکالنا ممنوع ہے تو مردوں کے درمیان ان کا تقریر کرنا اور درس دینا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کا آواز کا بھی پردہ ہونا چاہیے، کیوں کہ اس میں بھی بہ ہر حال کشش ہوتی ہے۔

۲- میں اپنے شہر کی ناظمہ ہوں۔ اس ذمّے داری کی وجہ سے مجھے امیر مقامی، ناظم شہر، ناظم علاقہ اور کچھ دیگر مرد ارکان سے خواتین کے سلسلے میں فون پر بات کرنی ہوتی ہے اور ان لوگوں کے بھی فون آتے ہیں۔ کیا میرا ان سے فون پر بات کرنا صحیح ہے؟ کہیں یہ شرعی حدود سے تجاوز تو نہیں؟

۳- کہا جاتا ہے کہ عورت کا دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو'' (الاحزاب: ۳۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب 'پردہ' میں اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''عورت کو ایسے تمام فرائض سے سبک دوش کیا گیا ہے، جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مثلاً اس پر نماز جمعہ واجب نہیں ہے، اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اس کے لیے جنازوں میں شرکت بھی ضروری نہیں۔ بل کہ اس سے روکا گیا ہے۔ اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی، اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجد میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی، لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا۔ اس کو محرم کے بغیر سفر کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ غرض ہر طریقے سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانونِ اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھروں میں رہے۔'' ان باتوں کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے خواتین کو اپنے گھروں میں ٹِک کر بیٹھنے کا حکم دیا ہے تو خواتین کا مقامی سطح کے ہفتے وار اور ماہانہ اجتماعات اور علاقے اور حلقے کی سطح کے اجتماعات میں شرکت کے لیے گھر سے نکلنا کس حد تک درست ہے؟ اور وہ دعوتی کاموں میں کس حد

تک سرگرم رہ سکتی ہیں؟ کیا ان کا دیگر خواتین کی اصلاح کے لیے اور ان سے انفرادی ملاقاتوں کے لیے بار بار ان کے گھروں میں جانا صحیح ہے۔

حدیث کی رؤ سے عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور وہ اس کے دائرے میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔ گویا گھر سے باہر کی خواتین کے درمیان تبلیغ واصلاح کی ذمے داری ہماری نہیں ہے، تو پھر ہم خواتین کو اپنے گھر سے باہر جا کر دیگر خواتین کو اکٹھا کر کے اجتماعات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

۴- میں نے ایم اے تک پڑھائی کی ہے۔ میرے شوہر چاہتے ہیں کہ آگے بھی پڑھائی جاری رکھوں یا ٹیچنگ کروں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گھر سے باہر تو نکلنا پڑے گا۔ بسا اوقات ان اداروں میں مخلوط تعلیم کا نظم ہوتا ہے۔ کیا ان اداروں کو جوائن کیا جاسکتا ہے؟ پردے کے اہتمام کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کوشش جائز ہے یا غیر ضروری ہے؟

۵- میں نے انٹر کرنے کے بعد جماعت کے ایک پرائمری اسکول میں دو سال ٹیچنگ کی۔ اس وقت تک مجھے دین کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ وہاں پڑھانے کے دوران اسکول کے پرنسپل، منیجر اور بعض دیگر افراد نے میری تربیت کی، مجھ میں دین کا شعور پیدا کیا اور میری زندگی کو تحریک سے جوڑ دیا۔ ان لوگوں کی حیثیت میرے نزدیک معلم جیسی ہے۔ آج بھی میں اپنے دینی مسائل کا حل جاننے کے لیے ان حضرات سے مدد لیتی ہوں۔ میں ان سبھی کے سامنے رو در رو بیٹھ کر بات کرتی ہوں۔ اس موقع پر میں ساتر لباس میں تو ہوتی ہوں، مگر چہرہ نہیں ڈھانپتی۔ یہ سبھی حضرات تحریک اسلامی کے رکن ہیں اور عمر دراز ہیں۔ میری رہ نمائی فرمائیں کہ مجھے اسی طریقے پر رہنا چاہیے یا ان لوگوں سے ملنا جلنا ختم کر دینا چاہیے؟

محترم! مجھے ڈر لگتا ہے کہ جن کاموں کو میں نیکی سمجھ کر کر رہی ہوں، کہیں ان سے میرے گناہ تو نہیں بڑھ رہے ہیں؟ میری آخرت تو نہیں خراب ہو رہی ہے؟ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی

جس سے اللہ کے عائد کردہ حدود پامال ہوں۔ بہ راہِ کرم میری رہ نمائی فرمائیں کہ میں کیا کروں؟

جواب: اپنے اعمال کے بارے میں ہمہ وقت حساس رہنا ایمان کی علامت ہے۔ اللہ کے نیک بندے کو ہر لحہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں اس سے کوئی ایسا گناہ یا ایسی لغزش تو نہیں سرزد ہو رہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دیتی ہو اور اس کے غضب کو بھڑکاتی ہو، جب کہ اللہ کا نافرمان بندہ اس فکر سے بے پروا ہوتا ہے۔ صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسی بات کو تمثیل کے انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''مومن سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس پر اس طرح خوف طاری ہو جاتا ہے گویا وہ کسی پہاڑ کے دامن میں ہے اور وہ پہاڑ اس پر گرا چاہتا ہے اور فاجر اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس پر اس کی کیفیت بس ایسی ہوتی ہے گویا کوئی مکھی اس کی ناک پر بیٹھی تھی جسے اس نے ہانک دیا۔'' (ترمذی: ۲۴۹۷)

آپ نے جو سوالات دریافت کیے ہیں، وہ عام طور سے تحریکی حلقے کی خواتین کو درپیش رہتے ہیں۔ میں اپنے فہم کے مطابق ان کے جوابات تحریر کر رہا ہوں۔ امید ہے ان سے آپ کی الجھنیں رفع ہو جائیں گی۔

۱- یہ سوال کہ ایسے اجتماعات میں، جہاں مرد بھی رہتے ہوں، کیا عورت قرآن، حدیث کا درس دے سکتی ہے یا تقریر کر سکتی ہے؟ دراصل ایک دوسرے سوال پر مبنی ہے کہ کیا عورت کی آواز کا پردہ ہے یا نہیں؟ اگر عورت کی آواز کا پردہ ہے کہ اجنبی مردوں کے لیے اس کا سننا جائز نہ ہو تو ظاہر ہے کہ مشترک اجتماعات میں کسی بھی طریقے سے اس کا اظہارِ خیال کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس مسئلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض فقہا عورت کی آواز کے پردے کے قائل ہیں۔ علامہ حصکفیؒ حنفی فرماتے ہیں:

اِنَّ صَوْتَ الْمَرْأۃِ عَوْرَۃٌ عَلَی الرَّاجِحِ۔ (حصکفی، الدر المختار مع رد المحتار، طبع بیروت، ۵۳۱/۹)

''راجح قول کے مطابق عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے۔''

اسی طرح مالکی فقہاء علامہ قرطبیؒ اور قاضی ابن العربیؒ نے لکھا ہے:

اِنَّ الْمَرْأَۃَ کُلَّھَا عَوْرَۃٌ بَدَنھَا وَ صَوْتَھَا۔

(ابو عبد اللّٰہ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، طبع مصر، ۲۲۷/۱۴، القاضی ابن العربی، احکام القرآن، طبع بیروت، ۱۵۷۹/۳)

''عورت سراپا قابلِ ستر ہے۔ اس کا بدن بھی اور اس کی آواز بھی۔''

اس بنا پر ان فقہاء نے نماز میں امام کی کسی غلطی پر اسے متنبہ کرنے کی صورت میں عورت کے لیے منہ سے آواز نکالنے کو منع کیا ہے۔ لیکن بعض فقہا کا خیال ہے کہ عورت کی آواز کا پردہ نہیں ہے۔ الموسوعۃ الفقھیۃ میں فقہ شافعی کی مشہور کتاب مغنی المحتاج کے حوالے سے درج ہے:

اَمَّا صَوْتُ الْمَرْأَۃِ فَلَیْسَ بِعَوْرَۃٍ عِنْدَ الشَّافِعِیَّۃِ وَ یَجُوْزُ الْاِسْتِمَاعِ اِلَیْہِ عِنْدَ أَمْنِ الْفِتْنَۃِ۔ (الموسوعۃ، طبع کویت، ۴۷/۳۱)

''شوافع کے نزدیک عورت کی آواز کا پردہ نہیں ہے۔ فتنہ کا اندیشہ ہو تو اسے سنا جا سکتا ہے۔''

قرآن کی روشنی میں مؤخر الذکر فقہا کی رائے درست معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے حکم دیا ہے:

اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلاَ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَ قُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوْفًا (الاحزاب: ۳۲)

''اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بل کہ صاف سیدھی بات کرو۔''

اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے بات ہی نہ کریں، بل کہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ بوقت ضرورت بات کرتے وقت وہ اپنی آواز میں لوچ اور نرمی پیدا نہ کریں اور ان کی باتیں صاف، بے آمیز اور بھلائی پر مبنی ہوں۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: 'قول معروف سے مراد وہ درست بات ہے جو نہ شریعت کی نگاہ میں قابل گرفت ہو اور نہ جسے لوگ برا سمجھتے ہوں' (القول المعروف ھو الصواب الذی لا تنکرہ الشریعۃ ولا النفوس۔ (تفسیر القرطبی، ۱۷۸/۱۴) امام رازیؒ نے لکھا ہے: 'اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت اجنبی مردوں سے بدزبانی

کرے، بل کہ اس آیت میں وقتِ ضرورت اچھی بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے'(ان ذلک لیس امراً بالایذاء والمنکر، بل القول المعروف و عند الحاجة هو المأمور به لا غیر۔ تفسیر کبیر، طبع قاہرہ۔ ۲۵ / ۱۸۲)

عہد نبویؐ میں عورتیں آں حضرت ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتی تھیں۔ وہاں مرد بھی ہوتے تھے، ان کی موجودگی میں وہ آپؐ سے مختلف سوالات کرتی تھیں۔ ان کی گفتگو کبھی مختصر ہوتی تھی اور کبھی طویل۔ آں حضرت ﷺ نے کبھی اس چیز کا اظہار نہیں فرمایا کہ مردوں کی موجودگی میں عورتوں کو خاموش رہنا چاہیے اور اپنے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالنی چاہیے۔ ایک موقع پر حضرت اسماء بنت زید بن سکنؓ نامی صحابیہ اللہ کے رسول ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئیں اور دوسری خواتین کی ترجمانی کرتے ہوئے اسلامی معاشرے میں اپنی خدمات اور ان پر اجر کے حوالے سے مفصل گفتگو کی۔ آپؐ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: 'کیا تم لوگوں نے کسی عورت کو اپنے دین کے متعلق اس عورت سے زیادہ بہتر انداز میں سوال کرتے سنا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! ہم نے نہیں سنا' (ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرہ اسماء بنت زید بن سکن، ۴ / ۲۳۷، بر حاشیہ الاصابة فی تمییز الصحابة، مطبعة السعاوة مصر)

ایک موقعے پر مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند سے یہی سوال کیا گیا کہ عورت کے لیے آواز کا پردہ ہے یا نہیں؟ اس کا انھوں نے یہ جواب دیا:

> 'عورت کے لیے اجنبی مردوں سے بلا وجہ بات چیت کرنا ناپسندیدہ ہے۔ لیکن بہت سی علمی، دینی، معاشی ضروریات کے تحت اسے بات چیت کرنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ کسی نامحرم سے بات چیت کے وقت عورت کی آواز میں لوچ نہ ہو۔ اس کی آواز ایسی نہ ہو کہ غیر مرد کے دل میں کوئی برا خیال آئے، بل کہ اس کے لب و لہجے میں کسی قدر درشتی ہو اور بات نیکی، تقویٰ اور دین و دنیا کی بھلائی کی ہو۔' (اسلام کا عائلی نظام، طبع دہلی، ص: ۱۸۱)

۲۔ عورت کا اجنبی مردوں سے وقتِ ضرورت بالمشافہ گفتگو کرنا جائز ہے تو فون کے ذریعے بھی اس کا ان سے رابطہ کرنا اور گفتگو کرنا جائز ہوگا۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

۳۔ عورت کا دائرہ کار اس کا گھر اور مرد کا دائرہ کار بیرونِ خانہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ عورت گھر سے باہر کے کسی کام کی انجام دہی کے لیے نکل ہی نہیں سکتی اور مرد کے لیے اندرونِ خانہ کوئی کام کرنا روا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عام ضروریات کی انجام دہی کے لیے عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

قَدْ اَذِنَ اللّٰہُ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِکُنَّ۔

(بخاری: ۵۲۳۷، مسلم: ۲۱۷)

''اللہ نے تم عورتوں کو اجازت دی ہے کہ اپنی ضروریات کے لیے گھروں سے باہر جاسکتی ہو۔''

حوائج (ضروریات) میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس میں دنیوی ضروریات بھی شامل ہیں اور دینی ضروریات بھی۔ اگر عورتیں سودا سلف، گھریلو سامان اور ملبوسات وغیرہ کی خریداری کے لیے بازاروں میں جاسکتی ہیں تو وہ اپنی دینی معلومات میں اضافے کے لیے اجتماعات اور مذہبی پروگراموں میں بھی شریک ہوسکتی ہیں۔ اگر وہ اپنے والدین اور اعزّہ واقارب سے ملاقات کے لیے ان کے گھروں میں جاسکتی ہیں تو دینی وتحریکی روابط بڑھانے کے لیے دوسری خواتین کے گھروں میں بھی جاسکتی ہیں۔ قرآن کریم سے ہمیں اس معاملے میں رہ نمائی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ: ۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا مومن مردوں کے ساتھ ساتھ مومن عورتوں کی بھی ذمے داری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ذمّے داری اپنے آپ کو گھر تک محدود رکھ کر کما حقہ نہیں انجام دی جاسکتی۔ مرد اور عورتیں دونوں سماج کا حصہ ہیں۔ اس کی فلاح و بہبود کے لیے دونوں کو مل کر کام کرنا ہے۔ دین کی تبلیغ واشاعت، معروفات کا قیام، منکرات کا

ازالہ دونوں عورت اور مرد کی مشترکہ جدوجہد اور باہمی تعاون کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دونوں شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے مل جل کر اور ایک دوسرے کے تعاون سے ان کاموں کو انجام دیں۔

۴- تعلیم حاصل کرنا مردوں اور عورتوں دونوں کا بنیادی حق ہے۔ اس میں دینی تعلیم بھی شامل ہے اور دنیوی تعلیم بھی۔ ہر طرح کی تعلیم لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی حاصل کرسکتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ لڑکیوں کے لیے ابتدائی مرحلے سے اعلیٰ سطح تک تعلیم کے علاحدہ ادارے ہوں، جن میں وہ آزادی، یک سوئی اور اطمینان کے ساتھ تعلیم حاصل کرسکیں۔ ایسے ادارے قائم بھی ہورہے ہیں۔ لیکن چوں کہ ابھی وہ بہت محدود تعداد میں ہیں اور ہر علاقے میں نہیں پائے جاتے ہیں، اس وجہ سے مسلم لڑکیوں کو مخلوط تعلیمی اداروں میں داخلہ لینا پڑتا ہے۔ جہاں لڑکیوں کے لیے علاحدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی سہولت نہ ہو وہاں وہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے اور پردے کے اہتمام کے ساتھ مخلوط تعلیمی اداروں کو جوائن کرسکتی ہیں۔

۵- خواتین کی غیر محرم اور اجنبی مردوں سے ملاقات کے سلسلے میں شریعت نے کچھ حدود متعین کی ہیں۔ ان کی رعایت کرتے ہوئے ان سے ملاقات کی جاسکتی ہے اور ان سے گفتگو اور تبادلۂ خیال کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت کے لیے ضروری ہے کہ کسی اجنبی مرد سے تنہائی میں ہرگز نہ ملے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ (بخاری: ۵۲۳۳، مسلم: ۱۳۴۱) وہ ہر اس چیز سے اجتناب کرے، جس میں مرد کے لیے کشش ہو، مثلاً تیز خوش بو، شوخ رنگ کے کپڑے اور زیب و زینت وغیرہ۔ گفتگو شریفانہ انداز میں، حیا اور وقار کے ساتھ اور اخلاقی حدود میں رہ کر کی جائے۔ ناز، نخرے اور لبھانے والا انداز نہ ہو۔ (الاحزاب: ۳۲) اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ساتر لباس میں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا لباس نہ اتنا تنگ ہو کہ جسم کے نشیب و فراز نمایاں ہوں اور نہ اتنا باریک کہ بدن جھلکے۔ بدن کے سارے

اعضاء ڈھکے ہوئے ہوں اور سینے پر دوپٹا ہو۔ (النور:۳۱) جہاں تک اجنبی مردوں کے سامنے عورت کے لیے اپنا چہرہ کھولنے یا نہ کھولنے کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں فقہا کا اختلاف ہے۔ بعض چہرہ چھپانے کو واجب قرار دیتے ہیں، جب کہ بعض کا خیال ہے کہ سورہ النور کی آیت: ۳۱ اور بعض احادیث سے چہرہ اور ہتھیلی کا استثناء معلوم ہوتا ہے۔ مولانا مودودیؒ عورت کے لیے اجنبی مردوں سے چہرہ چھپانے کے قائل ہیں۔ یہ اختلاف عہد صحابہ سے موجود ہے اور دونوں گروہوں کے پاس مضبوط دلائل ہیں۔ اس لیے کسی کے موقف کو یک سر رد نہیں کیا جاسکتا۔ مناسب ہے کہ عورت کو آزادی دی جائے کہ وہ اپنے لیے جو موقف بہتر سمجھتی ہو، اختیار کرلے۔

تحریکی خواتین کے دائرۂ عمل سے متعلق سطورِ بالا میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں، ان کے ساتھ چند اور باتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے:

۱- مردوں کے پروگراموں میں خواتین کے ذریعے اور خواتین کے پروگراموں میں مردوں کے ذریعے اظہار خیال کے مواقع شدید ضرورت کے تحت ہی فراہم کیے جانے چاہییں۔ اگر مذہبی اجتماعات میں مطلوبہ موضوعات پر تقریر کرنے کے لیے باصلاحیت مرد موجود ہوں تو خواتین کے ذریعے اسٹیج سے یا پس پردہ تقریر کروانے سے بچنا مناسب ہے۔ بسا اوقات قدامت پرستی اور جمود پسندی کے طعنوں سے خود کو بچانے کے لیے ہم اپنے اجتماعات میں ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں تو ان سے ہمیں جتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہم مسلم عوام کو اپنے سے دور کر دیتے ہیں۔ یہ دانش مندی نہیں ہے۔ کبھی کبھی کسی کام کے جائز ہونے کے باوجود عوام کی ناپسندیدگی کی بنا پر اسے چھوڑنا مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ جانتے ہوئے کہ خانۂ کعبہ پورے طور پر ابراہیمی بنیادوں پر قائم نہیں ہے، اسے منہدم کرا کے ازسرنو تعمیر نہیں کرایا۔ اس کے پیچھے یہی مصلحت تھی۔

۲- تحریکی خواتین کو اپنی دینی و دعوتی سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے حتی الامکان شبہات

کے مواقع سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے اور ذمّے داروں اور رفقاء سے ملاقات کرتے وقت پوری احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔ تاکہ کسی کو انھیں بدنام کرنے اور ان کے خلاف باتیں بنانے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ اس سلسلے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اسوے سے رہ نمائی ملتی ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ مسجد میں معتکف تھے۔ آپؐ کی زوجہ حضرت صفیہؓ آپؐ سے ملنے آئیں۔ واپسی میں آپؐ انھیں رخصت کرنے مسجد کے دروازے تک تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں سے دو انصاری صحابی گزر رہے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو کسی خاتون کے ساتھ دیکھا تو اپنی رفتار اور تیز کردی۔ آپؐ نے انھیں پکارا اور فرمایا: ''ٹھہرو! یہ میری بیوی صفیہ ہیں۔'' ان دونوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! سبحان اللہ، ہم آپؐ کے بارے میں کوئی غلط بات کیوں کر سوچ سکتے ہیں۔'' آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ الشَّیطَانَ یَجرِیُ مِنَ الاِنسَانِ مَجرَی الدَّمِ۔ (بخاری:۱۷۱۷)

''شیطان انسان کے دل میں وسوسے ڈالنے کے لیے اس طرح سرگرم رہتا ہے جس طرح اس کی رگوں میں خون دوڑتا ہے۔''

۳- اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش ہو یا تحریکی سرگرمیاں انجام دینے اور تحریکی افراد سے روابط کا مسئلہ ہو، تحریکی خواتین کے لیے اپنے سرپرستوں (ماں باپ ہوں یا دوسرے رشتہ دار یا شوہر) کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ وہ جو بھی کام کریں ان کو بتا کر اور ان کے مشورے سے کریں۔ اس طرح انھیں ان کی جانب سے تعاون اور ہم دردی بھی حاصل ہوگی اور کسی قسم کی بدگمانی کو در آنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ بسا اوقات انھیں اعتماد میں لیے بغیر یا ان کی عدم رضا مندی کے باوجود تحریکی کام انجام دینے سے بڑے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۴- ترجیحات کا تعین ضروری ہے۔ ہر عورت کے لیے لازم ہے کہ پہلے اپنے گھر پر توجہ دے، پھر دوسرے لوگوں کی فکر کرے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَ وَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ۔ (بخاری:۱۳۸۷، مسلم:۱۸۲۹)

''عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگراں ہے، اس سے ان کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

اس معاملے میں بسا اوقات بڑی کوتاہیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ والدین یا ان میں سے کوئی ایک، گھر سے باہر تحریکی سرگرمیاں انجام دینے میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ بچوں پر کما حقہ اس کی توجہ نہیں رہ پاتی اور وہ انھیں پورا وقت نہیں دے پاتا، جس کی بنا پر بچوں کی صحیح ڈھنگ سے تربیت نہیں ہو پاتی اور وہ تحریک سے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے تحریکی گھرانوں کا یہی المیہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں حدودِ شرع کا پابند بنائے۔ آمین

چہرہ اور آواز کا پردہ: معتدل نقطۂ نظر

سوال: 'تحریکی خواتین کا دائرۂ عمل' کے زیر عنوان ایک مراسلہ نگار خاتون کی ذہنی الجھنوں اور عملی دشواریوں کا جو جواب محترم ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب نے عنایت فرمایا ہے، اس میں بعض امور قابل غور ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ''بعض فقہاء عورت کی آواز کے پردے کے قائل ہیں، لیکن بعض فقہاء کا خیال ہے کہ عورت کی آواز کا پردہ نہیں ہے۔'' تائید میں انھوں نے سورۂ الاحزاب کی آیات: ۳۲-۳۳، پیش کی ہیں۔ اس سے موصوف نے یہ روشنی اخذ کی ہے کہ ''اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے بات ہی نہ کریں، بل کہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ وقتِ ضرورت بات کرتے وقت وہ اپنی آواز میں لوچ اور نرمی پیدا نہ کریں'' یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ 'روشنی' صحابۂ کرام کو بھی نظر آئی تھی؟ تابعین اور تبع تابعین نے بھی یہ روشنی اخذ کی تھی؟ اور ان حضرات کا اور ان کی خواتین کا عمل اسی روشنی میں تھا؟

مولانا مودودی آیت مذکور میں 'قَرْنَ' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: '' آیت کا منشا یہی ہے کہ عورت کا اصل دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ اس کو اس دائرے میں رہ کر اطمینان کے

ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں اور گھر سے باہر صرف بہ وقت ضرورت ہی نکلنا چاہیے۔''

محترم ندوی صاحب نے ایک عالم دین کی حیثیت سے بتایا ہے کہ'' اجنبی مردوں کے سامنے عورت کے چہرے کھولنے نہ کھولنے کا مسئلہ اختلافی ہے۔ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف عہد صحابہ سے موجود ہے۔ دونوں گروہوں کے پاس مضبوط دلائل ہیں۔ مناسب ہے کہ عورت کو آزادی دی جائے کہ وہ اپنے لیے جو موقف بہتر سمجھتی ہو اختیار کرلے۔''

جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر میں غالباً کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جس میں چہرے کے بے پردہ ہونے کے دلائل دیے گئے ہوں اور یہ ترغیب دی گئی ہو کہ جماعت سے منسلک خواتین خود انتخاب کرلیں کہ چہرہ کھول کر باہر نکلنے کا موقف انھیں پسند ہے یا چہرہ ڈھانپ کر۔ خود ندوی صاحب بھی فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ دونوں میں سے کس کو ترجیح دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دونوں قرآن وسنت کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔

میں اپنی تمام تحریکی بہنوں اور بیٹیوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اس موضوع پر کم سے کم مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے مباحث پڑھ لیں، جو سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں ان بزرگوں نے تفہیم القرآن اور تدبر قرآن میں تفصیل سے فرمائے ہیں۔ مولانا مودودیؒ کے بارے میں ندوی صاحب فرماتے ہیں:'' مولانا مودودیؒ عورت کے لیے اجنبی مردوں سے چہرہ چھپانے کے قائل ہیں۔'' میں عرض کروں گا کہ صرف قائل نہیں، بل کہ مدلل بحث کرکے فرماتے ہیں:' عہد صحابہ وتابعین کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخ اسلام میں گزرے ہیں انھوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔'' مولانا نے تفصیل سے ان کی آراء نقل کی ہیں۔ اور یہ عبارت تو انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے کہ'' کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا اس کے خلاف اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطۂ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے، بہ ہر حال اگر وہ تعبیر کی بد دیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غلطی نہیں کرسکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف یہ مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا یہ تسلیم کرکے

کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے۔''

(تفہیم القرآن، جلد چہارم، ص ۱۳۲)

محترم ندوی صاحب آج جس معاشرے میں رہتے ہیں اس سے بہ خوبی واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے سماج میں 'روشن خیالی' اور 'جدیدیت' کی جو لہر چل رہی ہے وہ ہماری خواتین اور خود ارکان و کارکنان کے لیے کتنی بڑی آزمائش ہے؟! ہر سطح کے اجتماعات میں اظہار خیال، درس، تقریر وغیرہ کے لیے خواتین کو استعمال کیا جا رہا ہے، 'غضِ بصر' کا کیا حشر ہو رہا ہے؟!!

تحریکی رفقاء آواز اور چہرے کے پردے پر تو تفہیم القرآن، تدبر قرآن اور دیگر متعدد کتب کا مطالعہ کرتے ہیں اور دلائل سے بھی واقف ہیں۔ البتہ کوئی کتاب غالباً اس موضوع پر اردو میں دستیاب نہیں ہے، جس میں خواتین کی آواز اور چہرے کی بے پردگی پر قرآن وسنت سے دلائل دیے گئے ہوں اور دور نبوی اور اس کے بعد کے ادوار میں اس کے رواج پانے کے ثبوت پیش کیے گئے ہوں۔ میری ندوی صاحب سے درخواست ہے کہ وہ خود بھی اس پر لکھیں اور ایسی تصانیف کی نشان دہی بھی فرمائیں، تاکہ ہم سب کو درست رائے قائم کرنے میں سہولت ہو۔

جواب: محترم مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اس موضوع پر مدلل بحث کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان عورت کے لیے گھر سے باہر نکلتے وقت اپنا چہرہ چھپانا ضروری ہے اور جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جس میں چہرہ کے بے پردہ ہونے کے دلائل دیے گئے ہوں اور یہ ترغیب دی گئی ہو کہ جماعت سے منسلک خواتین خود انتخاب کر لیں کہ چہرہ کھول کر باہر نکلنے کا موقف انھیں پسند ہے یا چہرہ ڈھانپ کر۔ اس طرح شاید مراسلہ نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جماعت کے جملہ وابستگان کو لازماً مولانا مودودی کا موقف تسلیم کر کے اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ چوں کہ میں نے اپنے جواب میں کوئی حتمی رائے نہیں دی تھی، اس لیے ان کے الفاظ میں ''میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ دونوں میں سے کس کو ترجیح دوں۔ چناں چہ میں نے تحریکی خواتین کو یہ مشورہ دے ڈالا ہے کہ وہ چاہے چہرہ ڈھانپ کر گھر سے باہر نکلیں، چاہے کھول کر، رضائے الٰہی کا حصول ہر ایک شکل میں طے شدہ ہے۔''

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر تھوڑی سی تفصیل پیش کر دی جائے۔

مولانا مودودیؒ کا نقطۂ نظر

پردے کے سلسلے میں قرآن کریم کی دو آیتیں بنیادی ہیں۔ایک سورۂ النور کی آیت نمبر ۳۱: وَلاَ یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا اور دوسری سورۂ الاحزاب کی آیت نمبر ۵۹: ’یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلاَبِیْبِھِنَّ‘ مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں دونوں مقامات پر اور اپنی کتاب ’پردہ‘ میں اس موضوع پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے اور بہت پرزور الفاظ میں اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ مسلمان عورت کے لیے گھر سے باہر نکلتے وقت اپنا چہرہ چھپانا واجب ہے۔ تفصیل کے طالب ان بحثوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔محترم مراسلہ نگار نے بھی ان کے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں۔لیکن ساتھ ہی مولانا نے کچھ جملے ایسے بھی لکھ دیے ہیں، جو ان کے موقف کی شدت کو کم کر دیتے ہیں۔سورۂ النور کی آیت میں اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا سے کس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے؟ اس میں صحابہ و تابعین اور بعد کے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔بعض کے نزدیک اس سے مراد ظاہری کپڑے ہیں، بعض کے نزدیک چہرہ اور ہاتھ اور ان کے اسباب زینت، بعض کے نزدیک صرف ہاتھ اور بعض کے نزدیک صرف چہرہ۔ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد مولانا ان پر ان الفاظ میں گفتگو فرماتے ہیں:

> ”ہم کہتے ہیں کہ آپ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا کو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی مقید نہ کیجیے۔ایک مومن عورت، جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے، وہ خود اپنے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں؟ کب کھولے اور کب نہ کھولے؟ کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے؟ اس باب میں قطعی احکام نہ شارع نے دیے ہیں، نہ اختلاف احوال و ضروریات کو دیکھتے ہوئے یہ مقتضائے حکمت ہے کہ قطعی احکام وضع کیے جائیں۔جو عورت اپنی حاجات کے لیے باہر جانے اور کام کاج کرنے پر مجبور ہے اس کو کسی وقت ہاتھ بھی کھولنے کی ضرورت پیش آئے گی اور چہرہ بھی۔ایسی عورت کے لیے بہ لحاظ ضرورت اجازت ہے اور جس عورت کا یہ حال نہیں ہے اس کے لیے بلا ضرورت قصداً کھولنا درست نہیں۔“

(پردہ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۰۷، ص: ۲۲۲، ۲۲۳)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تنقید

اقتباس بالا میں مولانا مودودیؒ نے جو بات کہی ہے وہ ان کے اصل موقف سے مختلف ہے، بل کہ دونوں میں تضاد محسوس ہوتا ہے۔ اس تضاد کو مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے بھی محسوس کیا تھا۔ 'پردہ' کے مباحث جب ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور کے کئی شماروں میں شائع ہوئے تو اس پر مولانا اصلاحی نے ایک استدراک لکھا، جو اس کے شمارہ مئی جون ۱۹۴۰ (ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۳۵۹ھ، جلد:۱۶، شمارہ ۳، ۴) میں 'پردہ پر تنقیدی نظر' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے جہاں بہ حیثیت مجموعی پورے مقالے پر مبارک باد دی وہیں اس کے بعض مباحث پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے لکھا:

'پردے کے احکام' کے عنوان سے جو فصل آپ نے لکھی ہے، اس کو میں نے خاص اہتمام سے پڑھا۔ مجھ کو افسوس ہے کہ میں اس فصل سے مطمئن نہیں ہوا اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میری طرح اور بہت سے لوگ بھی اس میں اضطراب محسوس کریں گے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ آپ کو اس کی طرف توجہ دلاؤں، تاکہ مضمون کو بہ صورت کتاب چھاپتے وقت اگر آپ ضرورت محسوس کریں، اس بحث کو اور زیادہ صاف کردیں۔'' (ترجمان القرآن، مئی جون ۱۹۴۰، ص:۱۰۸)

آگے انھوں نے مولانا مودودی کے اسی اقتباس کو جسے سطور بالا میں نقل کیا گیا ہے، درج کرکے اسے کتاب کے دیگر مباحث سے غیر ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ان کی اس تنقید کو قبول نہیں کیا۔ چناں چہ ان کے استدراک پر جا بہ جا اپنے نوٹ لگائے اور دونوں کو ایک ساتھ شائع کیا۔ دونوں بزرگوں کے نقطہ ہائے نظر کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ یہ واضح رہے کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ بھی عورت کے لیے چہرے کا پردہ واجب قرار دیتے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' اور بعض دیگر کتابوں میں بہت اچھی بحث کی ہے۔

دوسری رائے

دوسری رائے یہ ہے کہ اجنبی مردوں کے سامنے عورت کے لیے اپنی زینت کے اظہار کی جو ممانعت ہے، اس سے چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ ہیں۔ وہ انھیں ان کے سامنے کھول سکتی ہے۔ یہ رائے متعدد صحابۂ کرام، تابعین اور فقہاء سے مروی ہے۔ ان میں ابن عباس، ابن عمر، انس رضی اللہ عنہم اور

مجاہد، ضحاک، سعید بن جبیر اور اوزاعی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے اقوال تفسیر طبری اور جصاص کی احکام القرآن میں منقول ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے بھی ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک چہرہ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہے، اس لیے اس کا پردہ شرعاً واجب نہیں ہے، البتہ فتنہ کا اندیشہ ہوتو اسے چھپانا ضروری ہے۔ دیگر فقہی مسالک (مالکیہ، شوافع اور حنابلہ) میں چہرہ چھپانا واجب ہے۔ لیکن سببِ وجوب میں ان کے علما کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اسے ستر میں شامل ہونے کی بنا پر واجب قرار دیتے ہیں اور بعض فتنے کی وجہ سے۔ تفصیلات کتبِ فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ دوسری رائے عصر حاضر کے بعض علماء کی بھی ہے۔ ان میں شیخ محمد الغزالیؒ اور علامہ یوسف القرضاوی مدظلہٗ قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ غزالی کی کتاب کا اردو ترجمہ 'معرکۂ حجاب اور عورت کی دنیا' کے نام سے شائع ہوا ہے اور علامہ قرضاوی کے فتاویٰ کے دو حصے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے شائع کردیے ہیں۔ برصغیر ہند میں مولانا شمس پیرزادہ نے اپنی تفسیر 'دعوۃ القرآن' میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور اسی دوسری رائے کے حق میں دلائل پیش کیے ہیں۔

علامہ البانیؒ کا نقطۂ نظر

موجودہ دور کے علماء میں عورت کے چہرہ چھپانے کے عدم وجوب پر سب سے زیادہ مفصل اور مدلل بحث مشہور محدث علامہ محمد ناصر الدین الالبانیؒ (م ۱۹۹۹ء/ ۱۴۱۰ھ) نے کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب حجاب المرأة المسلمة فی الكتاب والسنة میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ گھر سے باہر نکلتے وقت ایک عورت اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رکھ سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ اعضاء ستر میں شامل نہیں ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر اگرچہ آیات قرآنی سے بھی بحث کی ہے، لیکن ان کی اہم دلیل یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں خواتین اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلا رکھتی تھیں، لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے اس پر کبھی نکیر نہیں فرمائی۔ اس موقف کی تائید میں انھوں نے کئی احادیث اور واقعاتِ سیرت پیش کیے ہیں۔ اس موقع پر مولانا مودودیؒ اور شیخ البانیؒ کے درمیان پردے کے موضوع پر ہونے والے مباحثے کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا مودودی کی کتاب 'پردہ' کا عربی ترجمہ 'الحجاب' کے نام سے جب دمشق سے شائع ہونے لگا

تو ناشر نے علامہ البانیؒ سے اس پر 'تعقیب' لکھوا کر اسے اصل کتاب کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس تعقیب میں انھوں نے پہلے بعض ان احادیث پر کلام کیا ہے، جن سے 'پردہ' میں 'عورتوں کے لیے ستر کے حدود' کے عنوان کے تحت استدلال کیا گیا ہے اور انھیں ضعیف قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ احادیث قرآن کریم اور سنت ثابتہ کے خلاف ہیں۔ آخر میں انھوں نے چند ایسی احادیث نقل کی ہیں جن سے ان کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔

مولانا مودودیؒ نے اس تعقیب پر شیخ البانیؒ کا شکریہ ادا کیا، لیکن ناشر کے رویے پر سخت تعجب اور ناگواری کا اظہار کیا کہ اس نے کیوں ان کے علم اور اجازت کے بغیر ان کی کتاب پر ایک دوسرے شخص سے استدراک لکھوا کر شامل کتاب کر دیا؟ انھوں نے شیخ البانی کا جواب تیار کیا اور ناشر سے مطالبہ کیا کہ وہ کتاب کی مزید اشاعت اس وقت تک روک دے جب تک ان کے جواب کا عربی ترجمہ بھی اس کے ساتھ شامل نہ کر دیا جائے اور جن لوگوں تک یہ کتاب پہلے پہنچ چکی ہے انھیں بھی یہ اوراق طبع کرا کے پہنچا دیے جائیں۔ مولانا مودودیؒ کی اصل تحریر ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور جنوری ۱۹۶۰ء جلد: ۵۳، شمارہ: ۴ میں 'پردہ' پر چند اعتراضات اور ان کا جواب' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

شیخ البانیؒ کے موقف پر عالم عرب میں بھی بعض حضرات نے نقد کیا ہے۔ مثلاً شیخ تویجری نے 'الصارم المشهور' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں عورت کے چہرے کے پردے کو واجب قرار دیا ہے اور شیخ البانیؒ کے دلائل کا رد کیا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اپنی کتاب 'حجاب المرأة المسلمة' پر نظر ثانی کی اور اپنے نقطۂ نظر کے حق میں مزید دلائل اور تائیدی احادیث و روایات پیش کیں۔ یہ کتاب نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ جلباب المرأة المسلمة کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شیخ البانیؒ نے مولانا مودودیؒ کے جواب کا پھر جواب دیا ہے اور ان کے متعدد تسامحات کی نشان دہی ہے۔ چہرے کے پردے کو واجب قرار دینے والوں کے رد میں شیخ البانیؒ کی ایک اور کتاب ہے۔ اس کا نام ہے: 'الردّ المفحم علی من خالف العلماء و تشدد و تعصب والزم المرأة بستر وجهها و کفیها و أوجب، ولم یقنع بقولهم انه سنة و مستحب' (مسکت جواب ان لوگوں کا جنھوں نے علماء کی مخالفت کی اور شدت پسندی اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت کے چہرہ چھپانے کو واجب

قرار دیا اور ان کی یہ بات نہ مانی کہ چہرہ چھپانا سنت اور مستحب ہے، لیکن واجب نہیں)

یہ اختلافی تحریریں جن لوگوں کی نظروں سے گزر جائیں ان پر یہ بات مخفی نہ رہے گی کہ اجنبی مردوں سے عورت کے چہرہ چھپانے کے وجوب یا عدم وجوب کے سلسلے میں صدرِ اسلام سے اب تک دونوں نقطۂ نظر رہے ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔ کسی ایک نقطۂ نظر کو بالکلیہ رد کر دینا اور اسے غلط قرار دینا درست نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شیخ البانی کے نقطۂ نظر کے مطابق عورت کے لیے اپنا چہرہ کھلا رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں متعدد احادیث اور روایات ایسی نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں چہرے کا پردہ معروف تھا اور خواتین اس پر عمل کرتی تھیں۔ انھوں نے ان لوگوں پر سخت الفاظ میں نقد کیا ہے، جو چہرے کے پردے کو 'بدعت' اور 'دین میں نئی ایجاد' قرار دیتے ہیں اور صراحت سے لکھا ہے کہ ''چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو ڈھانپنے کی اصل قرآن وسنت میں موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں اپنا چہرہ اور ہاتھ ڈھانپتی تھیں۔'' ان کا کہنا یہ ہے کہ ''مسلمان عورت کا اجنبی مردوں سے اپنے چہرے اور ہاتھ کے علاوہ پورا بدن چھپانا واجب ہے۔ چہرہ کھلا رکھنا اگرچہ جائز ہے، لیکن اس کا ڈھانپنا افضل ہے۔'' ''خواتینِ اسلام کا چہرے کو چھپانا ایک مشروع ومحمود فعل ہے، اگرچہ یہ واجب نہیں ہے۔ اگر کوئی خاتون اس کا اہتمام کرتی ہے تو بہتر ہے اور اگر کوئی اسے ضروری نہیں سمجھتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' ''چہرہ اور ہاتھوں کو ڈھانپنے کو ہم مستحب سمجھتے ہیں اور اسی کی دعوت دیتے ہیں۔'' وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ''میں نے اپنی بیوی کو اسی کی تلقین کی ہے اور مجھے امید ہے کہ میری بیٹیاں جب جوان ہو جائیں گی تو وہ بھی اسی پر عمل کریں گی۔'' ایک بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ شیخ البانیؒ نے چہرے کو ستر وحجاب میں شامل نہ کرنے کی حمایت اس شرط کے ساتھ کی ہے کہ ان سے کسی زینت کا اظہار نہ ہو رہا ہو، کیوں کہ آیت وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ کا عمومی مطلب اور اس کی روح یہی ہے۔ اگر خواتین نے چہرہ اور ہاتھوں پر کسی زینت کا استعمال کر رکھا ہے تو ان کا پردہ کرنا واجب ہوگا۔

نفاق اور روشن خیالی کا الزام دینا ضروری نہیں

مولانا مودودیؒ نے چہرے کے پردے کی حمایت میں اپنی زوردار بحث کے ساتھ اس

کی مخالف رائے رکھنے والے کے لیے 'منافق' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ تفہیم القرآن (جلد ۴، صفحہ ۱۳۲) کے اس اقتباس سے ظاہر ہے، جسے محترم مراسلہ نگار نے نقل کیا ہے۔ خود انھوں نے اسے 'روشن خیالی' اور 'جدیدیت' کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ چہرے کے پردے کے عدم وجوب کے قائلین کے لیے نفاق اور روشن خیالی کے الزامات عائد کرنا ضروری نہیں ہے۔

معتدل نقطۂ نظر

عورت کے لیے اجنبی مردوں سے چہرے کا پردہ واجب ہے یا نہیں؟ یہ ایک فقہی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ کی جو رائے ہے اس کی پابندی جماعت اسلامی کے ارکان اور وابستگان کے لیے ضروری نہیں۔ خود مولانا مودودیؒ نے یہ بات بار بار مختلف فقہی سوالات کے جوابات دیتے ہوئے کہی ہے۔ اس موضوع پر معتدل نقطۂ نظر کی ترجمانی پروفیسر خورشید احمد نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان کے ایک جواب سے ہوتی ہے۔ انھوں نے ایک خاتون کو، جو چہرے کے پردے کے عدمِ وجوب سے متعلق ایک مضمون پڑھ کر ذہنی الجھن کا شکار ہوگئی تھیں، لکھا:

> 'میں اسی حجاب کا قائل ہوں جو ہمارے دور کے مقتدر علماء بہ شمول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے پیش کیا ہے۔ البتہ میں یہ بات ضرور آپ سے کہنا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ میں ماضی میں بھی اور آج بھی، اسلامی تحریکات اور دینی حلقوں سے وابستہ لوگوں کے درمیان جہاں حجاب کی فرضیت پر کوئی دو آراء نہیں، وہاں حجاب کی تفصیلات کے بارے میں ضرور محدود اور متعین اختلاف پایا جاتا ہے۔ ثقہ علماء کا ایک گروہ چہرے کے حجاب کو ضروری سمجھتا ہے اور صرف آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو ما ظهر منها کے ذیل میں شمار کرتا ہے، جب کہ ماضی کے علماء اور فقہاء میں سے بہت کم اور آج کے برعظیم پاک و ہند کے علماء اور دوسرے اہلِ علم کے سوا ایک خاص تعداد اس رائے کی حامی ہے کہ ہاتھ اور پاؤں کے ساتھ بغیر زینت کے چہرہ کھلا رکھا جاسکتا ہے۔ البتہ بال اور گردن ڈھکی ہونی چاہیے۔ عرب دنیا، جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں کے علماء اور اسلامی تنظیموں کا بہ حیثیت مجموعی یہی موقف ہے اور وہاں کی اسلامی تحریکات سے وابستہ خواتین اسی پر عامل ہیں۔ البتہ یہ وضاحت کردوں کہ وہاں بھی ایک تعداد ایسے علماء اور ان کے متبعین کی ہے جو چہرے کے حجاب کے قائل ہیں۔'

آگے مزید فرماتے ہیں:

''میرا اپنا تعامل ان علماء کی رائے کے مطابق ہے جو چہرے کے حجاب کے قائل ہیں۔ لیکن یہ زیادتی ہوگی کہ جو لوگ اپنے دلائل کے مطابق چہرے کے حجاب کے قائل نہیں ہیں، انھیں اس زمرے میں ڈال دیا جائے جو بے پردگی اور مغربی ثقافت و بے حجابی کے قائل ہیں۔ ہمیں جہاں اس راستے کو اختیار کرنا چاہیے اور اسی پر استقامت کا ثبوت دینا چاہیے جسے ہم شرعی دلائل یا معتبر علماء کی رائے کے احترام کی بنیاد پر اختیار کرتے ہیں اور بجا طور پر اس پر ہمیں اطمینان اور فخر ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے اجر اور قبولیت کی توقع رکھنی چاہیے، وہیں اگر دوسرا نقطۂ نظر کچھ ایسے دلائل کی بنا پر ہے، جو خواہ ہمیں مطمئن نہ کر سکے، لیکن جس کی نسبت شریعت کے ماخذ ہی کی طرف ہو تو ہمیں اس کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فقہ کے مختلف مکاتب فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔''

(ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، فروری ۲۰۰۳ء جلد: ۱۳۰، شمارہ: ۲، ص: ۹۳-۹۵)

آواز کا پردہ

چہرے کے پردے کی طرح آواز کے پردے کے معاملے میں بھی شدّت پسندی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اس معاملے میں مولانا مودودیؒ کے جواب پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب 'پردہ' کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک صاحب نے پردہ سے متعلق چند عملی سوالات اٹھائے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا: 'کیا عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب اوڑھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر محرم مردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا ہے؟' اس کا مولانا نے یہ جواب دیا:

''بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پردے کی پابندی کے ساتھ مردوں کو خطاب کرے۔ لیکن بالعموم یہ جائز نہیں ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن حالات میں یہ چیز جائز ہے اور کن میں جائز نہیں؟ صرف ایسے شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے منشا کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت بھی ان میں پائی جاتی ہو۔'' (رسائل و مسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۰۷ء/ ۱۰۷، ۱۰۸)

خلاصہ یہ کہ دین کے کسی معاملے میں شریعت میں جتنی گنجایش موجود ہے اس سے فائدہ اٹھانا معیوب اور ناپسندیدہ نہیں ہے۔ بہ شرطے کہ نیت درست ہو اور احکامِ دین پر عمل کرنے کا جذبہ پایا جائے۔

کیا غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین جائز ہے؟

سوال: مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے، جو بینک اور حکومت کے دیگر اداروں کی طرف سے دیے جانے والے سود کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندستان دارالحرب ہے، اس لیے یہاں کے مسلمان غیر مسلموں سے ہی نہیں، بل کہ مسلمانوں سے بھی سود لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی ملک واقعی دارالحرب ہے تو کیا اس ملک میں سود کا لین دین مسلمانوں کے درمیان جائز ہے؟ فقہ کے اس مسئلے کا تعلق قیاس سے ہے یا حدیث سے؟ اس کے جواز میں بہ طور دلیل کوئی حدیث ہے تو بہ راہ مہربانی نقل کیجیے۔ سود کا تعلق گہرے طور پر اخلاقیات سے ہے۔ یہ بات اسلامی روح کے خلاف نظر آرہی ہے کہ دارالاسلام میں تو سود حرام ہو، لیکن دارالحرب میں مسلمان غیر مسلموں سے سود لے۔ جس طرح زنا اور چوری مسلم ملک میں حرام ہے، اسی طرح سود بھی مسلمانو ں کے لیے ہر ملک اور ہر صورت میں حرام ہونا چاہیے۔ بہ راہ کرم مدلّل طور پر اس مسئلے کی وضاحت فرمادیں:

جواب: فقہ و فتاویٰ کی کتابیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر فقہاء احناف کے دو گروپ ہیں۔ کچھ علماء غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ وہ 'ربا' نہیں ہے، جس سے قرآن و حدیث میں سختی سے منع کیا گیا ہے۔ جب کہ دیگر اسے ناجائز قرار دیتے ہیں اور اس کی حرمت کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ یہ اختلاف فقہاے احناف میں ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگرد امام محمدؒ جواز کے قائل ہیں، جب کہ ان کے دوسرے شاگرد امام یوسفؒ کے نزدیک یہ حرام اور ممنوع ہے۔ دیگر فقہاء: امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی سودی کاروبار، خواہ کسی مسلم ملک میں ہو یا غیر مسلم ملک میں، ہر حال میں حرام ہے۔ یہ بحث فقہ حنفی کی تمام مشہور کتابوں میں ملتی ہے۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے السیر الکبیر (سرخسی)، المبسوط (سرخسی)، المختصر (قدوری)، الهدایہ (مرغینانی)، فتح القدیر (ابن ہمام)،

کنز الدقائق (نسفی)، البحر الرائق (ابن نجیم)، فتاویٰ عالم گیری اور ردالمحتار (ابن عابدین شامی) وغیرہ۔ یہ اختلاف فقہاے متاخرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ چناں چہ مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ (مجموعۃ الفتاویٰ)، مفتی کفایت اللہؒ (کفایت المفتی)، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (فتاویٰ محمودیہ)، مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ (فتاویٰ رضویہ) اور بعض دیگر فقہاے احناف نے غیر مسلم ممالک میں غیر مسلموں سے سودی لین دین کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ دونوں فریقوں کے دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جواز کے قائلین کا موقف کم زور ہے۔ ان حضرات نے عام طور پر اپنی تائید میں یہ حدیث پیش کی ہے:

لاَ رِبَا بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ بَیْنَ اَهْلِ الْحَرْبِ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ۔

''دار الحرب میں مسلمانوں اور اہل حرب کے درمیان ربا نہیں۔''

اس حدیث کو امام ابو حنیفہؒ نے امام مکحولؒ سے روایت کیا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ مکحولؒ صغار تابعین میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ درمیان میں صحابی کا نام چھوٹ گیا ہے، یعنی یہ حدیث مرسل ہے۔ اگر چہ احناف اور مالکیہ نے تابعی کی مرسل روایت کو قابل استدلال قرار دیا ہے، لیکن دیگر علماء اس کا شمار حدیث ضعیف کی اقسام میں کرتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ حدیث اپنے مضمون میں صریح نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں نفی نہی کے معنی میں ہو۔ یعنی دار الحرب میں بھی مسلمان اہل حرب کے ساتھ سودی معاملے نہ کریں۔ جواز کے قائلین نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ حرمتِ ربا کی آیت (آل عمران: ۱۳۰) ۳ھ ہجری میں غزوۂ احد کے موقعے پر نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت ابن عباسؓ مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں مقیم تھے۔ وہ اس کے بعد بھی سالوں تک مکہ میں رہے اور وہاں کے مشرکین سے سودی کاروبار کرتے رہے۔ یہ دلیل بھی قوی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ مکہ میں رہنے کی وجہ سے انھیں اس حکم کا علم نہ ہو پایا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں حرمتِ سود کا حکم اتنے سخت الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انھیں پڑھ کر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لاَ یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا م وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ط وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o (البقرۃ:۲۷۵)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے، جسے شیطان نے چھوکر باولا کر دیا ہو، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے۔" حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آیندہ کے لیے وہ سود خوری سے باز آ جائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

اسی سورت میں آگے چند آیتوں کے بعد ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ o فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ج وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ج لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ o (البقرۃ:۲۷۹)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمھارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

سورۂ آل عمران میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص وَاتَّقُوا

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ (آل عمران: ۱۳۰)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔''

حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءً ا اَيْسَرُهَا اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ۔

(بیہقی، شعب الایمان، حدیث:۵۱۵۳، ابن ماجہ، سنن، حدیث:۲۲۷۴)

''سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں۔ اس کا سب سے کم تر درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔''

قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیات مطلق ہیں۔ ان میں مسلمانوں کو سود سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور باز نہ آنے والوں کو شدید وعید سنائی گئی ہے۔ اس بنا پر سودی لین دین چاہے مسلمانوں کے درمیان ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان، کسی مسلم ملک میں ہو یا غیر مسلم ملک میں، ہر جگہ اور ہر حال میں حرام اور ناجائز ہے۔ ماضی قریب کے متعدد اکابر علماء نے یہی فتویٰ دیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (فتاویٰ رشیدیہ) مولانا اشرف علی تھانویؒ (امداد الفتاویٰ)، مولانا مفتی محمد شفیعؒ (امداد المفتین)، مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ (فتاویٰ نذیریہ) اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ (فتاوی ثنائیہ) کے فتاوے۔

سودی کاروبار کرنے والے کی دعوت قبول کرنا

سوال: ایک صاحب لائف انشورنس کی ایک کمپنی میں ملازم تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ادھر ان سے ہمارے کچھ تعلقات بڑھے ہیں۔ انھوں نے ہمارے پروگراموں میں آنا شروع کیا ہے اور ہمیں بھی اپنے گھر بلاتے ہیں۔

بہ راہِ کرم واضح فرمائیں کہ کیا کسی لائف انشورنس کمپنی میں ملازمت کرنا جائز ہے؟ اور کیا اس میں ملازمت کرنے والے کسی شخص کی دعوت قبول کی جا سکتی ہے؟

جواب: آپ کے سوالات کے مختصر جواب درج ذیل ہیں:

۱- بینک اور لائف انشورنس کمپنیاں چوں کہ سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں، اس لیے عام حالات میں ان کی ملازمت جائز نہیں۔

۲- کسی شخص کا ذریعۂ آمدنی مکمل طور پر ناجائز ہو یا اس کی آمدنی کا بڑا حصہ ناجائز کمائی پر مشتمل ہو تو اس کی دعوت نہیں قبول کرنی چاہیے۔

اس موضوع پر موجودہ دور کے ایک بڑے عالم دین، مفتی اور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے بعض فتاویٰ ان کی کتاب 'الفتاویٰ' سے نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

''LIC میں سود بھی ہے اور جوا بھی، اس لیے جائز نہیں اور اس جیسے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں۔ اسی طرح گناہ کے کام میں تعاون اور لوگوں کو اس کام کی طرف دعوت دینا بھی جائز نہیں۔ LIC ایجنٹ کو بھی ظاہر ہے کہ لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا پڑتا ہے، اس لیے یہ صورت جائز نہیں۔'' (کتاب الفتاویٰ، طبع دیوبند، ۵/ ۳۶۰-۳۶۱)

دعوت قبول کرنے کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

''اگر کسی شخص کا صرف سودی ہی کاروبار ہو یا زیادہ تر آمدنی سود پر مبنی ہو اور معلوم نہ ہو کہ دعوت کس رقم سے کی جارہی ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا درست نہیں۔ اگر اس کی آمدنی زیادہ تر حلال پر مشتمل ہو یا اس نے صراحت کر دی ہو کہ میں حلال حصہ یا آمدنی ہی سے دعوت کر رہا ہوں تو دعوت قبول کی جاسکتی ہے۔

اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات معلوم نہ ہو کہ اس کا کوئی کاروبار حرام پر بھی مبنی ہے تو ایسے شخص کے یہاں دعوت میں حلال وحرام کی بابت پوچھنا درست نہیں۔ کیوں کہ اس میں مسلمان کی ایذا اور توہین ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔'' (کتاب الفتاویٰ، ۶/ ۲۰۰)

''اگر معلوم ہو کہ دعوت سودی پیسے سے کی جارہی ہے تب تو دعوت میں شریک ہونا قطعاً جائز نہیں ہے اور اگر دعوت کا حلال پیسے سے ہونا معلوم ہو تو دعوت میں شرکت جائز ہے اور متعین طور پر اس کا علم نہ ہو تو پھر اس بات کا اعتبار ہوگا کہ اس کی آمدنی کا غالب ذریعہ کیا ہے؟ اگر غالب حصہ حرام

ہے تو دعوت میں شرکت درست نہیں اور غالب حصہ حلال ہے تو دعوت میں شرکت جائز ہے۔

سود خور سے تعلقات رکھنے اور اس کی تقریبات خوشی میں شرکت کرنے کا حکم بھی تقاضائے مصلحت سے متعلق ہے۔ یوں تعلق تو کافر و مشرک سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ پس اگر سود خود سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کی خصلت بد سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو تعلق رکھنا جائز ہے اور اس کی اصلاح کی امید کی نیت ہو تو بہتر ہے، ورنہ اجتناب بہتر ہے۔ کیوں کہ بری صحبت سے نفع کی امید نہیں اور نقصان کا اندیشہ ہے۔'' (ایضاً:۶/۲۰۱)

کالے خضاب کی شرعی حیثیت

سوال: میں سر اور داڑھی کے بالوں کی سفیدی دور کرنے کے لیے کالے خضاب کا استعمال کرتا ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں کالا خضاب لگانے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد ابو قحافہ کے بارے میں حکم دیا تھا کہ ان کے بالوں کی سفیدی دور کر دی جائے، لیکن کالے رنگ سے پرہیز کیا جائے۔

بہ راہ کرم وضاحت فرمایے کہ خضاب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا کالا خضاب استعمال کرنا پسندیدہ نہیں ہے؟ مارکیٹ میں بعض کمپنیوں کا تیار کردہ جو خضاب ملتا ہے اسے استعمال کرنے کے بعد کیا وضو اور غسل سے پاکی حاصل ہو جائے گی؟

جواب: بعض احادیث میں سفید بالوں میں خضاب لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

غَيِّرُوا الشَّيْبَ وَلاَ تَشَبَّهُوا بِالْيَهُوْدِ۔ (جامع ترمذی، ابواب اللباس، باب ماجاء فی الخضاب، حدیث:۱۷۵۲)

''بڑھاپے کی سفیدی کو بدل دو، یہود جیسے نہ بنو۔''

اس مضمون کی حدیث بخاری (کتاب اللباس:۵۸۹۹) مسلم (کتاب اللباس: ۲۱۰۳) ابوداؤد (کتاب الترجل: ۴۲۰۳) اور نسائی (کتاب الزینۃ: ۵۰۶۹) میں بھی مروی ہے۔ دوسری طرف بعض احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ علما نے دونوں کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

طبریؒ فرماتے ہیں: ''جن احادیث میں سفیدی کو بدلنے کا حکم دیا گیا ہے اور جن میں اس کی ممانعت آئی ہے، دونوں صحیح ہیں۔ ان کے درمیان تناقض نہیں ہے۔ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے تمام بال سفید ہو گئے ہوں اور ممانعت اس شخص کے لیے ہے، جس کے ابھی چند ہی بال سفید ہوئے ہوں۔ اس معاملے میں علمائے سلف کا اختلاف احوال کے اختلاف کی بنا پر ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس سلسلے میں حکم اور ممانعت دونوں بالاجماع وجوب کے لیے نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے دو مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں نے ایک دوسرے کا رد نہیں کیا ہے۔

(بہ حوالہ شوکانی، نیل الاوطار، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر، ۱۳۴۴ھ، ۱/۱۴۶)

اسی طرح بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خضاب کا استعمال کیا ہے اور بعض احادیث میں ہے کہ آپؐ نے کبھی خضاب کا استعمال نہیں کیا۔ ان دونوں میں بھی تطبیق دی گئی ہے۔ طبریؒ کہتے ہیں: آں حضرت ﷺ کا معمول اکثر خضاب نہ استعمال کرنے کا تھا، البتہ بسا اوقات آپ نے اس کا استعمال کیا ہے۔ جن صحابہ نے آپؐ کو اس حال میں دیکھا انھوں نے صراحت سے بیان کر دیا کہ آپ خضاب کا استعمال کرتے تھے۔''

(نیل الاوطار، ۱/۱۴۷)

صدرِ اول میں جو چیزیں بہ طورِ خصاب مستعمل تھیں، ان میں سے حنا (مہندی)، زعفران، ورس اور کتم کا نام احادیث میں ملتا ہے۔ ورس ایک پودا ہے، جو رنگائی کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کا رنگ ہلدی کے مثل زرد ہوتا ہے۔ کتم کا رنگ سرخی مائل سیاہ ہوتا ہے۔ متعدد صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام سے خضاب کا استعمال ثابت ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ صرف حنا کا خضاب لگایا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ حنا میں کتم کی بھی آمیزش کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ زرد خضاب لگایا کرتے تھے۔

(نیل الاوطار، ۱/۱۴۵)

کالے خضاب کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ شوافع عام حالات میں اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ مالکیہ، حنابلہ اور احناف اسے حرام تو نہیں، البتہ مکروہ کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسفؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں: ''بعض علماء نے سیاہ خضاب کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔'' (ابن حجر، فتح الباری، دار المعرفة، بیروت، ۱۰/۳۵۴) ایک قول حضرت عمر بن الخطابؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کالا خضاب استعمال کرنے کا حکم دیتے تھے۔ (عبدالرحمٰن مبارک پوری، تحفة الاحوذی شرح جامع الترمذی، طبع دیوبند، ۵/۳۵۶) متعدد صحابۂ کرام سے بھی اس کا استعمال ثابت ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت جریر بن عبد اللہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ۔ تابعین اور بعد کے مشاہیر میں ابن سیرینؒ، ابو بردہؒ، محمد بن اسحاقؒ صاحب المغازی، ابن ابی عاصمؒ، اور ابن الجوزیؒ بھی کالا خضاب استعمال کیا کرتے تھے۔ (تحفة الاحوذی، ۵/۳۵۵، علامہ مبارک پوری نے اور بھی بہت سے تابعین و مشاہیر کے نام تحریر کیے ہیں۔ ۵/۳۵۷-۳۵۸)

کتب حدیث و سیرت میں ایک روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد ابو قحافہ کو قبولِ اسلام کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً نوّے سال تھی، (ابن الاثیر الجزری، اسد الغابة، دار الشعب قاهره، ۳/۵۸۳) حضرت ابوبکرؓ انھیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال بالکل ثغامہ کی مانند تھے۔ (ثغامہ ایک درخت کا نام ہے جس کا پھل اور پھول سفید ہوتے ہیں۔ جب وہ خشک ہوجاتے ہیں تو ان کی سفیدی اور بڑھ جاتی ہے) اس موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: غَيِّرُو هُمَا بِشَيْءٍ وَ جَنِّبُوا السَّوَادَ۔ ''ان کو یعنی ان کے بالوں کی سفیدی کو کسی چیز سے ختم کردو، البتہ انھیں سیاہ نہ کرنا۔''

(صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب استحباب خضاب الشیب، مزید ملاحظہ کیجیے سنن ابن ماجہ ۳۶۲۴، مسند احمد ۳/۱۶۰، ابن حجر، الاصابة فی تمییز الصحابة، دار المعرفة بیروت، ۲/۱۲۳۶، ابن الاثیر الجزری، اسد الغابة فی معرفة الصحابة، ۳/۵۸۱)

اس ممانعت کو بعض علماء نے حرمت اور بعض نے کراہت پر محمول کیا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''آں حضرت محمد ﷺ کا یہ ارشاد اس صورت کے لیے مخصوص تھا جب بال بہت زیادہ سفید ہونے کی وجہ سے برے لگنے لگتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہر ایک پر نہیں ہوتا۔ یہ بات آپؐ نے حضرت ابو قحافہؓ سے اس لیے فرمائی تھی کہ ان کے بال بہت زیادہ سفیدی کی وجہ

سے برے لگنے لگے تھے۔ ابن ابی عاصمؒ کہتے ہیں: ''اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کالے خضاب کا استعمال لوگ عموماً کیا کرتے تھے۔'' ابن شہابؒ کہتے ہیں: ہم کالے خضاب کا استعمال کیا کرتے تھے، جب چہرہ ترو تازہ تھا (اس پر جوانی کے آثار تھے) لیکن جب جھریاں پڑ گئیں اور دانت گر گئے (ہم بوڑھے ہو گئے) تو ہم نے اسے ترک کر دیا۔'' (فتح الباری، ۱۰/ ۳۵۵)

فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بالوں کی سفیدی کو خضاب کے ذریعے دور کرنے کی اجازت مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ خضاب کے مادّہ کو دھو دینے کے بعد بالوں پر اس کا جو رنگ چڑھ جاتا ہے وہ مانعِ طہارت نہیں ہے، اس لیے خضاب لگانے والے کا وضو اور غسل درست ہوگا۔ (الموسوعۃ الفقهیة کویت، ۲/ ۲۸۱-۲۸۲)

عورتوں کے لیے سونے کا استعمال

سوال: نکاح کی ایک مجلس میں ایک بزرگ نے وعظ و نصیحت کی چند باتیں کہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے درمیان رواج پانے والے اسراف اور فضول خرچی پر تنقید کی اور فرمایا کہ ہم اپنی بیٹیوں کا رشتہ طے کرتے ہیں تو سب سے پہلے سناروں کی دوکانوں پر پہنچ کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا بیٹیوں کو زیورات نہ دیے جائیں؟ اس کا انھوں نے جواب دیا کہ اگر دینا ہے تو چاندی کے زیورات دیے جائیں۔ اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کو ناپسند کیا ہے اور ان کے بہ جائے چاندی کے زیورات استعمال کرنے کی ترغیب دی ہے۔ دوسرے صاحب نے اس مضمون کی حدیث کی صحت پر شبہ ظاہر کیا تو تیسرے صاحب نے بتایا کہ یہ حدیث شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی کتاب 'فضائل صدقات' میں موجود ہے۔ اس بحثا بحثی سے میں کنفیوژن کا شکار ہو گیا ہوں۔ بہ راہ کرم اس مسئلے میں شریعت کی روشنی میں ہماری رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: متعدد صحیح احادیث میں صراحت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سونے کے زیورات کا استعمال مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ مثلاً حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: 'سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کے لیے حرام ہیں۔' (نسائی: ۵۱۴۴ تا ۵۱۴۹) علامہ البانیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک آدمی کو سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا: 'تم میں سے کوئی شخص جان بوجھ کر آگ کا انگارا اپنے ہاتھ میں پہن لیتا ہے۔' (مسلم: ۲۰۹۰) ایک موقع پر شاہِ حبشہ نجاشی نے آپؐ کی خدمت میں کچھ تحائف بھیجے، جن میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی۔ آپؐ نے اسے اپنی نواسی کو دے دیا اور فرمایا: 'بیٹی! لو اسے پہنو' (ابوداؤد: ۴۲۳۵) علامہ البانیؒ نے اسے حسن الاسناد کہا ہے۔

اسی کے عین مطابق صحابہ وصحابیات کا عمل تھا۔ چناں چہ صحابیات سونے کے زیورات کا استعمال کرتی تھیں اور صحابہ اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کو سونے کے زیورات پہناتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اتباع سنت کے معاملے میں بہت سخت تھے، اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونے کے زیورات پہناتے تھے۔ (موطا: ۱۰۵۰) ام المومنین حضرت عائشہؓ خود سونے کی انگوٹھی پہنا کرتی تھیں۔ (امام بخاریؒ نے اس کا تذکرہ اپنی صحیح، کتاب اللباس، باب الخاتم للنساء میں تعلیقاً اور ابن سعد نے الطبقات میں موصولاً کیا ہے)۔ اور وہ اپنی بھانجیوں کو بھی سونے کے زیورات پہنایا کرتی تھیں۔ (احمد فی مسائل عبداللہ ص: ۱۴۵) علامہ البانی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ عید کے موقع پر عورتوں کے مجمع میں تقریر فرمائی تو انھیں صدقہ وخیرات پر ابھارا۔ اس وقت حضرت بلالؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ آپؐ کا وعظ سن کر عورتیں اپنے زیورات اتار کر حضرت بلالؓ کے حوالے کرنے لگیں۔ (بخاری ۹۸، ۹۷۸، ۹۷۹، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۱۵۹) اس حدیث کی مختلف روایتوں میں عورتوں کے زیورات کے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں: فتخ (پازیب)، خواتیم (انگوٹھیاں)، قرط (بالیاں)، قلب (کنگن)، خرص (کڑے) اور سخاب (ہار)۔ اسی بنا پر جمہور علماء نے عورتوں کے لیے سونے کے ہر طرح کے زیورات کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ''جن احادیث میں سونے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت آئی ہے، ان کا تعلق مردوں سے ہے، عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس بات پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ اس کا استعمال عورتوں کے لیے جائز ہے۔'

(فتح الباری، ۱۰/ ۳۱۷)

اس کے بالمقابل کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں سونے کی مطلق حرمت مذکور ہے، یا ان

میں سونے کے زیورات استعمال کرنے والی عورتوں کو عذاب جہنم کی وعید سنائی گئی ہے اور ان کے بہ جائے چاندی کے زیورات پہننے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسی طرح بعض احادیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے گھر والیوں کو زیورات استعمال کرنے سے روکا ہے۔ ان احادیث میں کچھ ضعیف ہیں اور جو صحیح یا حسن ہیں وہ چوں کہ درج بالا احادیث سے ٹکراتی ہیں، اس لیے ان کی صحیح توجیہ اور دونوں کے درمیان تطبیق دینے کی ضرورت ہے۔

جن احادیث میں سونے کی مطلق حرمت بیان کی گئی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

''بربادی ہو سونے چاندی کے لیے۔'' (احمد، ۵/۳۶۶)

''جس نے سونے کا زیور پہنا، اس پر اللہ جنت میں سونے کا زیور حرام کردے گا۔''

(احمد، ۲/۱۶۶، ۲۰۸، ۲۰۹)

''کاش! میری امت سونے کے زیورات کا استعمال نہ کرتی'' (احمد، ۳/۲۰۹، ۵/۱۵۳، ۱۵۵، ۱۷۸، ۳۶۸)۔

''جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ ریشم اور سونا نہ پہنے'' (حاکم: ۴/۱۹۱، اسے احمد اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ علامہ البانیؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے)۔

''جس شخص نے سونے کا چمک دار زیور پہنا یا کسی کو پہنایا اسے روز قیامت اس کے ذریعے داغا جائے گا۔'' (احمد: ۴/۲۲۷)۔

''رسول اللہ ﷺ نے ریشم اور سونے کا استعمال کرنے سے منع کیا ہے۔'' (نسائی: ۵۱۵۱ تا ۵۱۶۰، احمد: ۴/۱۳۲)۔

''رسول اللہ ﷺ نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع کیا ہے۔''

(بخاری: ۵۸۶۴، مسلم: ۲۰۸۹)

ان احادیث کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا خطاب مردوں سے ہے۔ ان میں مردوں کا حکم بیان کیا گیا ہے، عورتیں ان سے مستثنیٰ ہیں۔

کچھ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو بھی سونے کا زیور

استعمال کرنے سے منع کیا ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''تباہی و بربادی ہے عورتوں کے لیے دو سرخ چیزوں کی وجہ سے: سونا اور زعفرانی کپڑا۔'' (ابن حبان، بیہقی، شعب الایمان) علامہ البانیؒ نے اس کی سند کو جید کہا ہے اور اس حدیث کو اپنی کتاب سلسلة الاحادیث الصحیحة میں درج کیا ہے۔انھوں نے علامہ منادیؒ کے حوالے سے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں نہیں ہیں، بل کہ یہ بات ان عورتوں کے بارے میں کہی گئی ہے جو سونے کے زیورات اور زعفرانی کپڑے پہن کر اور خوب بناؤ سنگار کر کے بے پردہ ہو کر اور مٹکتی اتراتی ہوئی گھر سے باہر نکلتی ہیں اور فتنے پھیلاتی ہیں۔'

(سلسلة الاحادیث الصحیحة، مکتبة المعارف الریاض، ۱۹۹۵/ ۱۴۱۵ھ، ۱/ ۶۶۴)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کی مجلس میں موجود تھا۔ایک عورت آئی اور اس نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! سونے کے کنگنوں کو استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ آگ کے کنگن ہیں۔اس نے پھر دریافت کیا: اور سونے کا ہار؟ آپؐ نے فرمایا: وہ آگ کا ہار ہے۔اس نے پھر دریافت کیا: اور سونے کی بالیاں؟ فرمایا: وہ آگ کی بالیاں ہیں۔راوی کہتے ہیں کہ اس وقت وہ عورت سونے کے دو کنگن پہنے ہوئے تھی، یہ سن کر اس نے انھیں اتار ڈالا۔اس موقع پر اس نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! عورت اگر اپنے شوہر کے لیے زیب و زینت اختیار نہ کرے تو وہ اسے ناپسند کرنے لگے گا۔آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایسا کیوں نہیں کرتی کہ چاندی کی بالیاں بنا لے، پھر انھیں زعفران یا عبیر سے رنگ لے۔''

یہ حدیث سنن نسائی (۵۱۴۲) اور مسند احمد (۲/ ۴۴۰) میں آئی ہے، لیکن اس کے ایک راوی ابوزید مجہول ہیں، جیسا کہ التقریب میں مذکور ہے۔اس لیے یہ ضعیف ہے۔

(آداب الزفاف فی السنة المطهرة، محمد ناصر الدین الالبانی، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۴۹ء، ص:۱۶۵)

ایک حدیث حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت سونے کا ہار پہنے گی اللہ عزوجل روز قیامت اس کے گلے میں آگ کا ہار پہنائے گا اور جو عورت اپنے کان میں سونے کی بالی پہنے گی، اللہ اس کے کان میں آگ کی بالی پہنائے گا۔'' یہ

حدیث سنن ابوداؤد (۴۴۳۸) اور سنن نسائی (۵۳۱۹) میں مروی ہے۔ لیکن اس کے ایک راوی محمود بن عمر مجہول ہیں، جیسا کہ ذہبی نے بیان کیا ہے، اس لیے یہ ضعیف ہے۔

(آداب الزفاف، حوالہ سابق)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو سونے کے زیورات پہننے سے منع کرتے تھے اور ان کے بہ جائے چاندی کے زیورات استعمال کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن دیکھے تو فرمایا: ''ان کو اتار دو اور ان کی جگہ چاندی کے کنگن استعمال کرو اور انھیں زعفران سے رنگ لو۔'' (نسائی: ۵۱۴۳) اسے خطیب، بزار، طبرانی اور سرقسطی نے بھی روایت کیا ہے۔ علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ایک مرتبہ سونے کا ایک زیور (شعائر) اپنے گلے میں ڈال لیا۔ رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوئے تو آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ حضرت ام سلمہؓ نے توجہ دلائی کہ دیکھیے، کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی سے تو منہ پھیر رہا ہوں۔ یہ سن کر ام المومنین نے اسے توڑ ڈالا۔ تب آپؐ نے ان کی طرف رخ کیا۔ اس موقع پر آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''تم میں سے کسی کا کیا بگڑ جائے گا، اگر وہ چاندی کے بُندے استعمال کرے اور انھیں زعفران سے رنگ لے۔'' (احمد: ۶/ ۳۱۵) طبرانی نے بھی اس کی روایت کی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے ملاقات کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کے گلے میں سونے کی ایک زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: اسے حسن کے ابو (یعنی حضرت علیؓ) نے مجھے تحفے میں دیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے فاطمہ! کیا تمھیں اس بات سے خوشی ہوگی کہ لوگ کہیں کہ محمد کی بیٹی کے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے۔'' یہ فرما کر آپؐ رکے نہیں اور واپس چلے آئے۔ حضرت فاطمہؓ نے وہ زنجیر بیچ دی اور جو پیسے ملے اس سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔ آپؐ کو پتا چلا تو فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے جس نے فاطمہ کو آگ سے بچا لیا۔''

یہ حدیث سنن نسائی (۵۱۴۰) اور مسند احمد (۳۷۸/۵) میں آئی ہے۔ طیالسی، حاکم، طبرانی اور ابن راہویہ نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ شیخ اسماعیل انصاری، علامہ شعیب الارناؤوط اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن علامہ البانیؒ اسے صحیح کہتے ہیں۔ (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، ۷۷۲/۱) انھوں نے اپنی کتاب آداب الزفاف کے نئے ایڈیشن کے مقدمے میں اسے ضعیف قرار دینے والوں کا رد کیا ہے۔

ایک روایت میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کو زیور اور ریشم کے استعمال سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''اگر تم لوگ جنت کا زیور اور ریشم چاہتے ہو تو دنیا میں انھیں نہ پہنو۔''

اس حدیث کو نسائی (۵۱۳۶) ابن حبان (۵۴۶۳) حاکم (۱۹۱/۴) اور احمد (۱۴۵/۴) نے روایت کیا ہے۔ علامہ البانیؒ نے اسے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (۶۶۳/۱) میں درج کیا ہے۔

درج بالا احادیث کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنے گھر والوں (ازواج و بنات) کو سونے کے زیورات استعمال کرنے سے منع کرنا اور ان کے بہ جائے چاندی کے زیورات استعمال کرنے کی ہدایت کرنا ان کے لیے سونے کی حرمت کے سبب نہیں تھا، بل کہ آپؐ کی شدید خواہش تھی کہ آپؐ کے قریبی افراد بھی مال و دولت کی چمک دمک سے دور رہیں۔ علامہ سندیؒ نے حاشیۂ نسائی میں لکھا ہے: 'اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے گھر والوں کو مطلق زیور سے منع کرتے تھے، چاہے وہ سونے کا ہو یا چاندی کا۔ شاید یہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ (بہ حوالہ سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، البانیؒ، ۶۶۳/۱)

کچھ اور احادیث ہیں جن میں مطلق سونے کے زیورات استعمال کرنے پر عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> 'جو شخص اپنے محبوب کو آگ کا کڑا (حلقہ) پہنانا چاہے وہ اسے سونے کا کڑا پہنا دے، جو شخص اسے آگ کا ہار (طوق) پہنانا چاہے وہ اسے سونے کا ہار پہنا دے

اور جو شخص اسے آگ کا کنگن (سوار) پہنانا چاہے وہ اسے سونے کا کنگن پہنا دے، اس کے بہ جائے تمھیں چاہیے کہ چاندی کا زیور پہناؤ' (ابوداؤد:۴۲۳۶، احمد:۲/۳۷۸)

اس حدیث کو علامہ البانیؒ نے حسن قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر اور اس مضمون کی دیگر احادیث کے پیش نظر ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کا مطلق استعمال جائز نہیں ہے، بل کہ بعض مخصوص طرح کے سونے کے زیورات (حلقہ، طوق اور سوار) ان کے لیے بھی حرام ہیں۔

کہا گیا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے ایک راوی (اسید) میں ضبط کے معاملے میں کمی تھی۔ علامہ البانیؒ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ جو کچھ کمی ہے وہ متعدد شواہد و متابعات سے دور ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ حدیث حسن ہے۔ ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ اس حدیث کا خطاب مردوں سے ہے۔ لیکن البانیؒ نے اس کی بھی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ حدیث کا خطاب عورتوں سے ظاہر ہے، اس لیے کہ اس میں چاندی کے زیور استعمال کرنے کا حکم ہے اور چاندی کا زیور مردوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب آداب الزفاف میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ان لوگوں پر نقد کیا ہے جو سونے کے زیورات کو عورتوں کے لیے مطلق حلال قرار دیتے ہیں۔

(آداب الزفاف، ص:۱۵۱-۱۵۷، سلسلة الاحاديث الصحيحة، ۱/ ۶۶۲)

اس معاملے میں علامہ البانیؒ کا موقف کم زور معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں، ان کی رو سے سونے کے ہر طرح کے زیورات کا استعمال عورتوں کے لیے جائز ہے۔ جن احادیث میں سونے کے زیورات پر عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، ان کی ایک توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ یہ احادیث ابتدائی زمانے کی ہیں اور منسوخ ہیں۔ کیوں کہ دیگر احادیث سے عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کے استعمال کا جواز ثابت ہے۔ دوسری توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ یہ وعید ان زیورات کے بارے میں ہے جن کی زکوٰۃ نہ ادا کی گئی ہو۔ (معالم السنن شرح سنن ابی داؤد، ابوسلیمان الخطابی، المطبعة العلمية حلب، ۱۹۳۳ء، ۴/ ۲۱۵-۲۱۶، الترغيب والترهيب، حافظ منذری، دار الحدیث قاہرہ۔ ۱۹۸۷ء، ۱/ ۵۵۷) اس توجیہہ کی تائید بعض ان احادیث سے ہوتی ہے جن میں زیورات کی زکوٰۃ ادا

کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ادا نہ کرنے کی صورت میں عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ چند احادیث درج ذیل ہیں:

حضرت اسماء بنت یزیدؓ فرماتی ہیں: ''میں اپنی خالہ کے ساتھ خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئی۔ ہم دونوں سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے۔ آپؐ نے ہم سے دریافت فرمایا: کیا تم اس کی زکوٰۃ نکالتی ہو؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمھیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے گا۔ ان کی زکوٰۃ نکالا کرو۔'' (احمد،۶/۴۶۱) اس مضمون کی حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے۔ مثلاً: (ابوداؤد:۱۵۶۳، ترمذی:۶۳۷، نسائی:۲۴۸۱)

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کے چمکیلے زیورات استعمال کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: کیا یہ 'کنز' ہے (جس کے رکھنے پر عذاب جہنم کی وعید سنائی گئی ہے) آپؐ نے فرمایا: اگر یہ نصابِ زکوٰۃ تک پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو کنز نہیں ہے۔' (ابوداؤد:۱۵۶۴۔ علامہ البانیؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے) اور یہ بات صرف سونے کے زیورات کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بل کہ بعض روایات کے مطابق آں حضرت ﷺ نے چاندی کے زیورات کے سلسلے میں بھی یہی ہدایت دی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے میرے ہاتھوں میں چاندی کے کڑے (فتخات) دیکھے تو فرمایا: عائشہؓ! یہ کیا؟ میں نے عرض کیا: انھیں میں نے آپ کے لیے زینت اختیار کرنے کے مقصد سے پہنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ میں نے عرض کیا: نہیں، یا کبھی کبھی۔ فرمایا: یہ عذاب جہنم کے لیے کافی ہیں۔ (ابوداؤد:۱۵۶۵)

ایک توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ زیورات کے سلسلے میں اصلاً ریاکاری اور دکھاوا ممنوع ہے۔ خواہ وہ سونے کے ہوں یا چاندی کے۔ (الترغیب والترہیب:۱/۵۵۸) چوں کہ چاندی کے زیورات عموماً سستے ہوتے ہیں اس لیے عورتیں ان میں دکھاوا نہیں کرتیں اور سونے کے زیورات عموماً بہت مہنگے ہیں، اس لیے عورتیں عموماً اپنی شان بگھارنے کے لیے ان کا دکھاوا کرتی ہیں۔ حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے اور اس پر عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے

عورتوں کی جماعت! کیا تم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ چاندی کے زیورات استعمال کرو۔ تم میں سے جو عورت بھی سونے کا زیور پہنے گی اور اس کا دکھاوا کرے گی اس کو عذاب دیا جائے گا۔'' (ابوداؤد: ۴۲۳۷، نسائی: ۵۱۳۷، ۵۱۳۸) اس کی سند میں ایک راوی ربعی بن خراش کی بیوی مجہول ہے۔ اس لیے علامہ البانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض محدثین اس توجیہ کے حق میں ہیں۔ امام نسائی نے اس مضمون کی چند احادیث پر یہ ترجمۃ الباب (عنوان) قائم کیا ہے: باب الکراھیة للنساء فی اظھار الحلی والذھب (اس چیز کا بیان کہ عورتوں کے لیے زیورات اور سونے کی نمائش مکروہ ہے) اور امام دارمیؒ نے درج بالا حدیث پر یہ عنوان لگایا ہے: باب فی کراھیة اظھار الزینة (اس چیز کا بیان کہ عورتوں کے لیے زینت کا اظہار مکروہ ہے)

مولانا محمد زکریاؒ نے اپنی کتاب فضائلِ صدقات میں حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے مروی حدیث، جس میں سونے کا ہار یا بالی پہننے والی عورت کو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، نقل کی ہے اور اس کی تشریح کے ضمن میں اس مضمون کی دیگر احادیث ذکر کی ہیں، جنھیں اوپر نقل کیا جاچکا ہے اور ان کی توجیہات کی ہیں۔ یہاں احادیث کو حذف کرتے ہوئے ان کی توجیہات کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> 'اس حدیث شریف سے عورتوں کے لیے بھی سونے کا پہننا ناجائز اور حرام معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے اس کو ابتدائے اسلام پر محمول کیا ہے۔ اس لیے کہ سب علماء کے نزدیک دوسری احادیث کی بنا پر عورتوں کے لیے سونے چاندی کا زیور جائز ہے، لیکن بعض علماء نے اس حدیث کو اور اس جیسی دیگر احادیث کو زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر محمول فرمایا ہے۔ بعض علماء نے ان روایات کی وجہ سے جن میں زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے اور سونے چاندی میں فرق کیا گیا ہے، یہ بھی فرمایا ہے کہ اس سے تکبر، تفاخر اور اظہار مراد ہے اور یہ بات عام طور سے مشاہدے میں آتی ہے کہ عورتوں کے یہاں چاندی کا زیور، بالخصوص جو عورتیں اپنی جہالت سے اپنے کو اونچے خاندان کی سمجھتی ہیں، کچھ وقعت اور اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ چاندی کے زیور کو کوئی اظہار یا تفاخر کی چیز نہیں سمجھتیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کے کنگن ہوں تو ذرا بھی ان کو اس کے اظہار کا داعیہ پیدا نہ ہو، لیکن سونے کے کنگن ہوں تو بے وجہ پچاس مرتبہ مکھی اڑانے کے بہانے سے ہاتھ

ہلائیں گی۔ بیس مرتبہ دوپٹہ درست کرنے کے واسطے ہاتھ کو پھیریں گی اور اس حرکت سے محض دوسرے پر تفاخر مقصود ہوتا ہے، اپنے زیور کو دکھانا ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں باتوں کا اہتمام بہت ضروری ہے کہ زیور سے تفاخر اور تکبر اور اس کا اظہار ہرگز نہ ہونا چاہیے اور اس کی زکوٰۃ بہت اہتمام سے ادا کرنی چاہیے اور دونوں میں سے اگر کوئی سی ایک بات کا بھی لحاظ نہ رکھا جائے تو اپنے آپ کو عذاب کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔'

(فضائل صدقات، حصہ اول، ص: ۲۵۷-۲۵۹)

زیورات کے مسئلے پر بہ طور خلاصہ الموسوعۃ الفقہیۃ کویت کی درج ذیل عبارت نقل کی جاتی ہے:

'فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کے لیے سونے چاندی کے ہر طرح کے زیورات کا استعمال جائز ہے۔ مثلاً گلوبند، ہار، انگوٹھی، کنگن، پازیب، تعویذ، بازوبند، پٹا، مالا اور ہر وہ چیز جو گلے میں پہنی جاتی ہے اور جسے عورتیں عموماً استعمال کرتی ہیں اور وہ اسراف کی حد کو نہ پہنچے یا اس میں مردوں سے مشابہت نہ ہو۔' (الموسوعۃ: ۱۸/ ۱۱-۱۲)

انگوٹھی میں پتھر کا استعمال

سوال: بعض حضرات ایسی انگوٹھی استعمال کرتے ہیں، جس میں بہ طور نگینہ کوئی پتھر لگا ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ اس پتھر کے جسم انسانی پر اثرات پڑتے ہیں اور مختلف بیماریوں میں افاقہ ہوتا ہے۔ بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا ایسی انگوٹھی کا استعمال درست ہے؟ اور کیا ایسا عقیدہ رکھنا جائز ہے؟

جواب: انگوٹھی کا استعمال زمانۂ قدیم سے ہوتا رہا ہے۔ سونے، چاندی اور دیگر دھاتوں کی انگوٹھیاں بنائی اور پہنی جاتی رہی ہیں۔ شرعی طور سے انگوٹھی پہننا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے جائز ہے۔ ہاں سونا (Gold) امتِ محمدیہ کے مردوں کے لیے حرام ہے۔ اس لیے سونے کی انگوٹھی پہننا ان کے لیے جائز نہیں۔ حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيْرُ لِاِنَاثِ اُمَّتِی وَ حُرِّمَ عَلٰی ذُکُوْرِهَا۔

(نسائی:۵۱۴۸)

''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کے لیے حرام ہے۔''

بعض احادیث میں آں حضرت ﷺ نے صراحت سے مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع کیا ہے۔ (بخاری: ۵۸۶۳، ۵۸۶۴، مسلم: ۲۰۶۶)

احادیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے لیے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی، جس سے آپؐ مہر کا کام لیا کرتے تھے۔ اس پر 'محمد رسول اللّٰہ' کندہ تھا۔ یہ انگوٹھی آپؐ کے وصال کے بعد خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ، پھر خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ، پھر خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے پاس رہی اور یہ حضرات اسے پہنتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں کہیں غائب ہوگئی۔

(بخاری:۵۸۶۶، مسلم ۲۰۹۱)

انگوٹھی کا نگینہ اسی دھات سے بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً چاندی کی انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی کا ہو، اور دوسری دھات کا بھی ہوسکتا ہے۔ چناں چہ عقیق، یاقوت اور دیگر قیمتی حجریات بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جو انگوٹھی بنوائی تھی، صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ اس کا نگینہ بھی چاندنی کا تھا (۵۸۷۰) لیکن صحیح مسلم میں روایت کے الفاظ یہ ہیں: كَانَ خَاتَمُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ وَرَقٍ وَ كَانَ فَصُّهٗ حَبْشِيًّا (۲۰۹۴) ''رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ حبشہ کا بنا ہوا تھا۔'' اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا تھا۔

جہاں تک حجریات کی تاثیر کا معاملہ ہے تو طب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ مختلف حجریات کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھیں اپنے پاس رکھنے، گردن میں لٹکانے یا کسی اور طرح سے اس کے خارجی استعمال سے جسم انسانی پر فلاں فلاں اثرات پڑتے ہیں۔ اس کا تعلق عقیدہ سے نہیں، بل کہ تجربے سے ہے۔ اگر کسی پتھر کا خارجی استعمال طبی اعتبار سے فائدہ مند ثابت ہو تو اسے انگوٹھی کا نگینہ بنالینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

موقع و محل سے تھوڑی بے ایمانی کی چھوٹ

سوال: ایمان داری مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ روپے وغیرہ کا لالچ نہیں ہے، لیکن میرے آفس میں میرے ساتھیوں نے تھوڑی بہت بے ایمانی کر کے کافی دولت اکٹھا کر لی ہے، جب کہ میں اپنے اہل و عیال کے لیے دو وقت کی روٹی کا بھی مشکل ہی سے انتظام کر پاتا ہوں۔ کیا موقع و محل سے تھوڑی بہت بے ایمانی کے لیے چھوٹ کی گنجائش ہے، کہ اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ میں بہت ہی تذبذب میں ہوں۔ میری الجھن کو دور فرمائیں۔

جواب: دین میں امانت داری کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اس کا تاکیدی حکم بیان کیا گیا ہے اور اس کا التزام کرنے والوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (النساء:۵۸)

''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''

سورہ المومنون (آیات:۱-۱۱) اور سورہ المعارج (آیات:۲۲-۳۵) میں جہاں اہلِ ایمان کے بہت سے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، وہیں ان کے اس وصف کو بھی نمایاں کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ۙ (المومنون:۸، المعارج:۳۲)

''جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔''

اس کے بالمقابل جو لوگ عہد و امانت کی پابندی نہیں کرتے ان کے دین و ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے خطبوں میں یہ جملے اکثر پڑھا کرتے تھے:

لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ، وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ.

(مسند احمد: ۳/ ۱۳۵، ۱۵۴، ۲۱۰)

''جس شخص میں امانت داری نہ ہو اس کا ایمان معتبر نہیں اور جو شخص عہد کا پابند نہ ہو اس کے دین کا کوئی اعتبار نہیں۔''

'امانت داری' کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ کسی شخص کے پاس کوئی رقم بہ طور حفاظت رکھوائی جائے تو وہ اس میں خرد برد نہ کرے، بل کہ اس کا بہت وسیع مفہوم ہے۔ کوئی راز کی بات بتائی جائے اور اس کا افشا کرنے سے منع کیا جائے تو وہ امانت ہے، کوئی ذمہ داری دی جائے تو وہ امانت ہے، آدمی کہیں ملازم ہو تو ملازمت سے متعلق کام امانت ہیں، کچھ خدمات اس سے متعلق ہوں تو ان کی صحیح طریقے سے انجام دہی امانت ہے۔ انسان کی صلاحیت اور وقت اس کے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ کسی طرح کے مالی معاملات اس سے متعلق ہوں تو ان کا صحیح ریکارڈ رکھنا امانت ہے۔

دین کا صحیح تصور یہ ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اور اس کے حکموں کے مطابق گزرے۔ نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا ہی عبادت نہیں ہے، بل کہ خالص دنیاوی کام بھی اگر اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق انجام دیے جائیں تو وہ بھی عبادت ہیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ صدقہ صرف اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ارشادات میں متعدد ایسے کاموں کو بھی صدقہ شمار کرایا جنھیں مطلق دنیاوی کام سمجھا جاتا تھا اور جن میں اجر و ثواب ہونے کا کسی کے ذہن میں خیال نہ آتا تھا۔ ایک موقع پر آپؐ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو متعدد باتوں کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اِنَّكَ مَهمَا اَنفَقْتَ مِنْ نَفقَةٍ فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ حَتّٰى اللُّقْمَة تَرفَعُهَا اِلٰى فِى امْرَاَتِكَ۔ (صحیح بخاری، کتاب الوصایا، حدیث: ۲۷۴۲)

''تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ تمھارے لیے صدقہ ہے، یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی جسے تم اٹھا کر اپنی بیوی کو دو گے۔''

صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

وَ لَسْتَ تُنْفِقُ نَفَقَةً تَبْتَغِى بِهَا وَجهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ بِهَا حَتّٰى اللُّقْمَةَ تَجْعَلُهَا فِى فِى امْرَاَتِكَ۔ (کتاب الوصیۃ، حدیث: ۴۲۰۹)

’’تم جو کچھ بھی خرچ کروگے، اگر اس سے تمھارا مقصود اللہ کی رضا جوئی ہے تو اس پر اجر کے مستحق ہوگے، حتی کہ اس لقمے پر بھی تمھیں اجر ملے گا جو تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو گے۔‘‘

آپ نے لکھا ہے کہ ایمان داری کے ساتھ ملازمت سے آپ کو جو کچھ ملتا ہے اس سے آپ کے اہل و عیال کے لیے دو وقت کی روٹی کا بھی مشکل سے انتظام ہو پاتا ہے۔ جب کہ آپ کے آفس کے ساتھیوں نے تھوڑی بہت بے ایمانی کر کے کافی دولت اکٹھا کر لی ہے۔ کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ بے ایمانی کے ذریعے اکٹھا کی گئی اپنے ساتھیوں کی دولت کو آپ رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ انھوں نے اپنے لیے دولت نہیں، بل کہ آگ کے انگارے اکٹھا کیے ہیں۔ کیا جہنم کی آگ کے انگارے رشک کرنے کی چیز ہیں۔

اس موقع پر قارون کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس کا تذکرہ قرآن نے بہت مؤثر اور عبرت انگیز اسلوب میں کیا ہے۔ اس نے بیان کیا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مال و دولت کے اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں ہی طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ اس کی عیش و عشرت اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر جو لوگ دنیاوی زندگی کے طالب تھے وہ کہنے لگے: ’’کاش! ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑے نصیبے والا ہے۔‘‘ مگر جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی دولت کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا تو وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے: ’’افسوس ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، نپا تلا دیتا ہے۔‘‘ (ملاحظہ کیجیے سورہ القصص: ۷۶-۸۲) دوسروں کا مال و دولت دیکھ کر اہلِ ایمان کا کیا رویہ ہونا چاہیے اسے بھی قرآن نے قارون کے مذکورہ واقعے کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ قارون کے ٹھاٹھ دیکھ کر جب کچھ لوگوں نے اس پر رشک کا اظہار کیا تو ’’جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے: افسوس تمھارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔‘‘ (القصص: ۸۰)

ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ ’’ایمان داری مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، روپے

وغیرہ کا لالچ نہیں ہے'' اللہ تعالیٰ آپ کی اس خوبی میں مزید اضافہ کرے، لیکن دوسری طرف آپ یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ '' کیا موقع و محل سے تھوڑی بے ایمانی کی جاسکتی ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو بے ایمانی کی شناعت، دنیاوی اور اخروی دونوں اعتبار سے اس کا جرم ہونا اور روزِ قیامت اس کی سزا کی ہولناکی کا احساس نہیں ہے۔ غلاظت غلاظت ہے، خواہ زیادہ ہو یا کم۔ میٹھے اور لذیذ مشروب کے ایک گلاس میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈال دیا جائے تو کیا کوئی سلیم الطبع انسان اسے پینا گوارا کرے گا؟ جس طرح بے ایمانی کر کے حاصل کیے گئے لاکھوں کروڑوں روپے حرام ہیں اسی طرح ایک پیسہ بھی حرام ہے۔

آپ کو فکر ہے کہ ایمان داری کے پیسے سے اہل و عیال کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام مشکل سے ہو پاتا ہے، اس لیے تھوڑی بے ایمانی سے کچھ اور رقم حاصل کر کے ان کے لیے آسائش فراہم کردی جائے۔ یہ بہت بڑی نادانی ہے کہ آدمی دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت خراب کرلے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَبْدٌ اَذْهَبَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَا غَيْرِهِ۔ (سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، حديث:۳۹۶۶، اسے ابن ابی شیبہ نے بھی اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ علامہ البانی نے اسے ضعیف، لیکن علامہ بوصیری نے حسن قرار دیا ہے)

'' قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں بدترین درجہ اس شخص کا ہوگا، جو دوسرے کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت برباد کردے۔''

دنیا میں تمام انسان آزمائش کی حالت میں ہیں۔ کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ مال و دولت دے کر آزمارہا ہے اور کچھ لوگوں کو اس سے محروم کر کے۔ سب امتحان گاہ میں ہیں۔ کچھ کے ہاتھ میں حساب (Mathematics) کا پرچہ دیا گیا ہے اور کچھ کے ہاتھ میں ادب (Literature) کا۔ بڑا نادان ہوگا وہ شخص جو اپنا پرچہ حل کرنے کے بہ جائے دوسرے کے پرچہ میں تاک جھانک کرتا رہے، یا لٹریچر کے پرچے میں ریاضی کے کیلکولیشن کرنے لگے۔

پریشانیوں کے ہجوم میں مومنِ صادق کا مطلوبہ رویہ

سوال: میں کئی سال سے بے حد پریشان ہوں۔ میری اہلیہ عرصہ سے بیمار ہیں۔ خود میں بھی مختلف امراض میں مبتلا ہوں۔ مسجد جانا دشوار ہوتا ہے۔ وہ دن میرے لیے بڑا مبارک ہوتا ہے، جس میں میری پنج وقتہ نمازیں مسجد میں ادا ہوتی ہوں۔ میرا بڑا لڑکا سروس میں ہے۔ ایک لڑکی کی شادی ہوگئی ہے، لیکن دو لڑکیاں، جو قبول صورت اور عصری تعلیم یافتہ ہیں، ان کی عمریں بھی زیادہ ہو رہی ہیں، لیکن اب تک ان کی شادی نہیں ہو پائی ہے۔ کہیں حتمی طور پر نسبت طے ہو جاتی ہے، لیکن پھر یک لخت منسوخ ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر مجھے بہت ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں، جیسے سانپ، زہریلے کیڑے مکوڑے، موذی جانور، بول و براز میں گھرے ہونا وغیرہ۔ ایک موقعے پر حمام کی دیواروں پر انسانی پاخانہ دیکھا گیا۔ اس حمام میں صرف ایک دروازہ ہے۔ ایک اور موقعے پر سوکھے گوشت کا ٹکڑا چھت سے گرتا ہوا دیکھا گیا، جب کہ چھت آرسی سی کی ہے۔ ان تمام باتوں کو ہم لوگ نظر انداز کرتے رہے۔ بعض حضرات کے مشوروں پر کثرتِ استغفار اور اسمائے حسنیٰ کا ورد کیا، مگر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

آپ سے گزارش ہے کہ اپنی دعاؤں میں شامل رکھیں اور اپنے مشوروں سے نوازیں۔

جواب: آپ نے اپنے جن حالات کا تذکرہ کیا ہے، وہ باعثِ تشویش ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو صبر کی قوت اور حالات سے نمٹنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور آئندہ ان میں بہتری فرمائے۔ آپ کے حالات پر بہ حیثیت مجموعی غور کرنے سے میری سمجھ میں جو باتیں آئی ہیں، انھیں ذیل میں تحریر کر رہا ہوں۔ ممکن ہے ان میں کچھ کام کی باتیں آگئی ہوں۔

آپ کی اہلیہ محترمہ عرصے سے بیمار ہیں۔ آپ خود مختلف امراض کا شکار ہیں، جس کی وجہ سے خواہش کے باوجود آپ کے لیے پنج وقتہ نمازوں کے لیے مسجد جانا دشوار ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ آپ کی دو لڑکیوں کی، شادی کی عمر کو پہنچ جانے اور تعلیم یافتہ اور قبول صورت ہونے کے باوجود، شادی نہیں ہو پا رہی ہے۔ ان چیزوں نے آپ کو شدید پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ آپ کی یہ پریشانی جسمانی سے زیادہ ذہنی ہے۔ جوں جوں دن گزر رہے ہیں آپ کی پریشانی، ذہنی

الجھن اور تفکرات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسے حالات میں ایک مومنِ صادق کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ صبر کرے۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ مختلف انسانوں کے لیے مختلف حالات پیدا کر کے انھیں آزماتا ہے۔ کسی کی آزمائش خوش حالی، صحت مندی، مال و دولت کی فراوانی، عیش و عشرت کے وسائل اور دیگر تنعّمات کے ذریعے ہوتی ہے تو کسی کو فقر و فاقہ، بیماری، تجارت میں خسارہ اور ذرائع معاش کی تنگی وغیرہ میں مبتلا کر کے آزمایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۝ (الانبیاء:۳۵)

''اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے ان نیک بندوں کا تذکرہ بڑے تعریفی و تحسینی کلمات سے کیا ہے جو کسی مصیبت کا شکار ہوتے ہیں تو اس پر جزع و فزع نہیں کرتے، بل کہ صبر کا دامن تھامے رہتے ہیں:

وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ۝ۙ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ (الحج:۳۴،۳۵)

''اور بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو، جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں۔''

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۝ۙ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۝

(البقرۃ:۱۵۵-۱۵۷)

''اور ہم ضرور تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے، انھیں خوش خبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔''

سورۂ تغابن میں ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ (التغابن:۱۱)

''کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی، مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے۔''

صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس پر راضی بہ رضا رہتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔'' (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

مصائب اور آزمائشوں پر صبر کرنا اور جزع وفزع نہ کرنا بڑی عزیمت کا کام ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ

(لقمان:۱۷)

''اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔''

قرآن نے حضرت ایوب علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ صبر کی اعلیٰ ترین مثال کی حیثیت سے پیش کی ہے۔ وہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہوئے، یہاں تک کہ ان کے متعلقین نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مگر انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اس موضوع پر احادیث بھی کثرت سے موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

مومن کسی بھی آزمائش سے دوچار ہوتا ہے اور کسی بھی مصیبت اور پریشانی کا شکار ہوتا ہے تو یہ چیز اس کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہے اور اگر وہ صبر کرے تو جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس موقع پر صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَجِبتُ لِلْمُسلِمِ، اِذَا اَصَابَهٗ خَیرٌ حَمِدَ وَ شَکَرَ، وَ اِذَا اَصَابَتهُ مُصِیبَةٌ اِحتَسَبَ وَ صَبَرَ، اَلمُسلِمُ یُوجَرُ فِی کُلِّ شَیٍٔ۔ (مسند احمد ۱/۱۷۷)

’’مسلمان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اسے کوئی خیر حاصل ہوتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور شکر کرتا ہے اور کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہر حال میں اجر کا مستحق ہوتا ہے۔‘‘

اپنی بیماری، اپنی اہلیہ کی بیماری، وقت پر بچیوں کی شادی نہ ہو پانا اور دیگر اعذار اور پریشانیاں، یہ سب آزمائش کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان پر راضی بہ رضا رہنا اور صبر کرنا ایک سچے مومن سے مطلوب و محمود ہے۔ صبر کی تلقین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو پریشانی درپیش ہے، اس سے نجات پانے کی کوشش نہ کی جائے۔ آدمی اگر کسی بیماری میں مبتلا ہے تو اس کا علاج معالجہ لازم ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

یَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوُوا، فَاِنَّ اللّٰهَ لَم یَضَع دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ دَوَاءً اِلَّا دَاءٌ وَاحِدٌ...... اَلهَرَمُ۔ (جامع ترمذی: ۲۰۳۸)

’’اے اللہ کے بندو، علاج کراؤ، اس لیے کہ اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں رکھی ہے، جس کی کوئی دوا نہ رکھی ہو، سوائے ایک بیماری کے اور وہ ہے بڑھاپا۔‘‘

یہی حال دیگر پریشانیوں کا ہے کہ انھیں دور کرنے اور ان سے نجات پانے کی کوشش کرنے کو شریعت میں مطلوب قرار دیا گیا ہے۔ وقت پر بچیوں کی شادی نہ ہو پا رہی ہو تو والدین کی پریشانی فطری ہے۔ اس پریشانی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔ اپنے خونی رشتہ داروں، سسرالی رشتہ داروں، بڑی بیٹی کے سسرالی رشتہ داروں، اگر بیٹے کی شادی ہوگئی ہے تو اس کے

سسرالی رشتہ داروں، کاروباری متعلقین، تحریکی احباب اور دیگر وابستگان سے رابطہ کیجیے۔ ان سے عرضِ مدّعا کیجیے۔ تحریکی اخبارات میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار کو بھی ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ امید ہے اس طرح کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور مل جائے گا۔

شادی ایک ایسا سماجی عمل ہے، جو بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ مختلف اسباب اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ایک سبب 'معیار کی برقراری' ہے۔ لڑکیاں جس سماجی معیار کے گھرانے کی ہوں، خواہش ہوتی ہے کہ ان کی شادی بھی اسی سماجی معیار کے گھرانوں میں ہو۔ پھر اگر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں تو ان کی شادی کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے سے کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ عام حالات میں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو پا رہا ہو تو معیارِ مطلوب سے کم پر Compromise کر لینا دانش مندی کا تقاضا ہے۔ میں ایسے متعدد خاندانوں کو جانتا ہوں جن میں لڑکیوں کی شادیاں ان سے کم پڑھے لکھے لڑکوں سے ہوئیں، مگر وہ خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔

آپ نے جن ڈراؤنے خوابوں کا تذکرہ کیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ ان کا تعلق آپ کی ذہنی پریشانی سے ہے۔ عموماً صحت زیادہ گرگئی ہو اور اعصاب کم زور ہوں تو ایسے خواب نظر آتے ہیں۔ آدمی دیگر پریشانیوں میں مبتلا ہو تو اس کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بچیوں کی نسبتیں طے ہوئیں، مگر کسی وجہ سے اچانک ٹوٹ گئیں تو اس موقع پر ذہنی پریشانی اور الجھن شدید تر ہوتی ہے۔ بیماری بھی لاحق ہو تو احساس کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں۔ نسبتوں کے ٹوٹنے کو کسی اور چیز پر محمول کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جس طرح لڑکی والوں کو شادی سے قبل لڑکے کے بارے میں ہر طرح کی تحقیقات کرنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح لڑکے والے بھی تمام معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور انھیں بھی اس کا حق دینا چاہیے۔ شادی سے قبل نسبت ٹوٹ جانا زیادہ بہتر ہے اس کے مقابلے میں کہ شادی ہوجائے اور بعد میں لڑکی سسرال میں اذیتوں سے دوچار ہو۔

باتھ روم کی دیواروں پر غلاظت کا لگا ہونا یا کمرے میں اوپر سے سوکھے گوشت کا ٹکڑا گرنا، اگر اس طرح کے واقعات پے در پے پیش آئیں تب تشویش ہونی چاہیے اور ذہن دوسری

طرف جانا چاہیے، لیکن اگر کئی سالوں میں ایک دو بار ایسا ہو گیا ہو تو اس کی کوئی معقول توجیہ کر لینی چاہیے۔ باتھ روم کی دیوار پر ممکن ہے روشن دان سے کبھی کسی گندگی کی چھینٹیں آ گئی ہوں، گوشت کا سوکھا ٹکڑا ممکن ہے کوئی چڑیا لائی ہو اور چھت کے پنکھے پر رکھ دیا ہو، بعد میں وہ وہاں سے نیچے گرا ہو۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہماری زندگی میں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کی ہم بروقت کوئی توجیہ نہیں کر پاتے، لیکن وہ معمول کے واقعات ہوتے ہیں۔ ہمارا ذہن چوں کہ دوسری طرف کام کر رہا ہوتا ہے، اس لیے ہم ان کی کوئی مناسب توجیہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ان حالات میں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دعاؤں کا التزام کیجیے۔ آپ کا ذہن اس طرف جا رہا ہے کہ کوئی آپ کے خلاف جادو ٹونا کر رہا ہے۔ میں اس امکان کو بالکلیہ رد نہیں کرتا، لیکن میرے نزدیک یہ امکان کم سے کم ہے۔ سحر کے اثرات ہوں تو بھی دعاؤں کے ذریعہ ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اپنے اطمینان کے لیے چاہیں تو کسی 'عامل' سے مدد لے لیں، لیکن ساتھ ہی خود بھی زیادہ سے زیادہ دعاؤں کا اہتمام کیجیے۔ نماز تہجد کی پابندی کیجیے، رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ بندے سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ عاجزی و فروتنی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں اپنے تمام مسائل کے حل کے لیے دعا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ضرور سنے گا۔

سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہ پڑھی جائے؟

سوال: قرآن مجید کی تمام سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جاتی ہے، ماسوا سورۂ توبہ کے۔ علامہ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ''حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جب قرآن مجید کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا گیا تو اس تھیلے کو نکالا گیا اور تمام سورتوں کی ترتیب، جیسے کہ رسول اللہؐ نے بتائی تھی، وہ قائم رکھ کر ان کی نقل تیار کی گئی۔ تو چوں کہ حضورؐ کی لکھوائی ہوئی سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ درج نہیں تھی، اس وجہ سے صحابہ کرامؓ نے بھی اسے درج نہیں کیا۔ باقی کوئی سورت قرآن مجید کی ایسی نہیں ہے، جس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہ ہوا ہو۔''

دراصل سورۂ توبہ کی ابتدا میں بسم اللہ کیوں نہ پڑھی جائے؟ اس کا سبب تشنہ رہ جاتا ہے۔ ازراہِ کرم اس جانب رہ نمائی فرمائیں، یا کسی تفسیر کا حوالہ دیں، تاکہ تشنگی دور ہو سکے۔

جواب: تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ توبہ کے شروع میں مولانا مودودیؒ نے جو نوٹ لکھا ہے، اس میں 'بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ' کے ذیلی عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے:

> ''اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھی جاتی۔ اس کے متعدد وجوہ مفسرین نے بیان کیے ہیں، جن میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مگر صحیح بات وہی ہے جو امام رازیؒ نے لکھی ہے کہ نبی ﷺ نے خود اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی، اس لیے صحابہ کرامؓ نے بھی نہیں لکھی اور بعد کے لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے رہے۔ یہ اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ قرآن کو نبی ﷺ سے جوں کا توں لینے اور جیسا تھا ویسا ہی اس کے محفوظ رکھنے میں کس درجہ احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔''

سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس سلسلے میں مفسرین نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت بس نکات و لطائف کی ہے۔ مثلاً علامہ قرطبیؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ اہل عرب جب کسی قوم سے کیے ہوئے اپنے معاہدوں کو منسوخ کرتے تھے تو منسوخی کے اعلان کے لیے تیار کردہ تحریر پر بسم اللہ نہیں لکھتے تھے۔ سورۂ توبہ میں بھی مشرکین سے کیے گئے معاہدے کی منسوخی کا اعلان ہے، اس لیے اس کا آغاز بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہیں کیا گیا اور جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ حج کے موقع پر ان آیات کو علی الاعلان سنا دیں تو انھوں نے بھی شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی۔

ایک دوسرا قول انھوں نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اصلاً امان اور رحمت کا مظہر ہے، جب کہ اس سورت سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ (تفسیر قرطبی، طبع مصر، ۱۹۸۷ء، ۸/ ۶۳) لیکن اس تاویل کو علامہ آلوسی نے ضعیف بتایا ہے۔ اس لیے کہ بعض دیگر سورتوں مثلاً مطففین، ہمزہ اور لہب وغیرہ کا آغاز بھی اللہ کے غضب سے ہوا ہے، مگر ان کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی جاتی ہے۔ (روح المعانی، طبع مصر، ۱/ ۴۱)

اس سلسلے میں قولِ فیصل وہی ہے جسے علامہ قرطبیؒ نے امام قشیریؒ کے واسطے سے نقل کیا ہے:

الصَّحِيحُ أَنَّ التَّسْمِيَةَ لَا تُكْتَبُ، لِأَنَّ جِبْرِئِيلَ مَا نَزَلَ بِهَا فِي هٰذِهِ السُّورَةِ۔ (تفسیر قرطبی، ۸/ ۶۳)

'صحیح بات یہ ہے کہ یہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس لیے نہیں لکھی جاتی، کیوں کہ حضرت جبریل علیہ السلام جو قرآن لے کر نازل ہوئے تھے، اس میں یہاں وہ نہیں تھی۔'

یہ تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھے جانے کی بات ہے۔ جہاں تک اس کے پڑھنے یا نہ پڑھنے کا معاملہ ہے، تو اس سلسلے میں علما فرماتے ہیں کہ چوں کہ یہاں وہ لکھی ہوئی نہیں ہے، اس لیے اسے پڑھنا بھی نہیں چاہیے۔ لیکن بعض علماء اس کے پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس موضوع پر علامہ آلوسی نے کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، جسے نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ امام سخاویؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

'مشہور ہے کہ سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ پڑھی جائے۔ عاصمؒ سے مروی ہے کہ پڑھنی چاہیے۔ یہ بات انھوں نے قیاساً کہی ہے۔ کیوں کہ اس کے لکھے نہ جانے کا سبب یا تو یہ ہے کہ اس میں مشرکین مکہ سے جنگ کی بات کہی گئی ہے، یا یہ ہے کہ صحابہ قطعی طور پر طے نہیں کر پائے تھے کہ یہ مستقل سورت ہے یا سورۂ انفال کا حصہ ہے۔ پہلی صورت میں اس کا حکم ان لوگوں کے ساتھ خاص ہوگا جن کے بارے میں یہ سورت اتری تھی اور ہم تو اسے برکت حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان آیتوں سے قرآن پڑھنے کا آغاز کیا جائے جن میں مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم ہے تو ان سے پہلے بسم اللہ پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ دوسری صورت میں بھی بسم اللہ پڑھی جا سکتی ہے، جس طرح سورتوں کے شروع میں بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ روایت میں ہے کہ مصحفِ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے شروع میں وہ لکھی ہوئی تھی۔' (روح المعانی: ۱۰/ ۴۲)

علامہ آلوسیؒ مزید فرماتے ہیں:

'ابن منادر کی رائے ہے کہ بسم اللہ (سورۂ توبہ کے شروع میں) پڑھنی چاہیے۔ الاقناع میں بھی اس کے جواز کی بات کہی گئی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسے نہ پڑھنا مستحب ہے، اس لیے کہ مصحف میں وہ درج نہیں ہے اور اس معاملے میں کسی دوسرے کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس جگہ بسم اللہ پڑھنے کو حرام قرار دینا اور نہ پڑھنے کو واجب کہنا، جیسا کہ بعض مشائخ شافعیہ کا خیال ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص درمیانِ سورۃ سے تلاوت شروع کرے، اس کے لیے بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)'' (روح المعانی: ۱۰/ ۴۲)

اس موضوع پر مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں صحیح رہ نمائی کی ہے:

’حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۂ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۂ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے، لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے، اس کو چاہیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کرے۔ بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی تلاوت میں کسی حال میں بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ یہ غلط ہے اور اس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بہ جائے بسم اللہ کے، یہ لوگ اس کے شروع میں اعوذ باللّٰہ من النار پڑھتے ہیں، جس کا کوئی ثبوت آں حضرت ﷺ اور صحابۂ کرامؓ سے نہیں ہے۔‘ (معارف القرآن، طبع دیو بند، ۴/۷۷)

قرآنی بیانات میں اختلاف وتضاد؟

سوال: قرآن کے مطالعہ کے دوران چند مقامات پر ذہنی الجھن کا شکار ہو گیا ہوں۔ بہ راہ کرم تشریح وتوضیح فرما کر ممنون فرمائیے:

(۱) سورۂ اعراف آیت ۲۹ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ۔ مولانا مودودی نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے: ”جس طرح اس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔“ ’جس طرح‘ کے لفظ سے فوراً یہ مفہوم ذہن میں آتا ہے کہ جس طرح اس نے تمھیں اب، یعنی ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا ہے، اسی طرح، یعنی ماؤں کے پیٹ سے، پھر پیدا کیے جاؤ گے۔ جب کہ قرآن کے دیگر مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو انسان مر چکے ہیں انھیں از سر نو پیدا نہیں کیا جائے گا، بل کہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ مثلاً سورۂ یٰسین آیت ۵۱ یہ ہے: وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ (پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکا یک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے) مذکورہ بالا دونوں بیانات ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں، جب کہ کلام الٰہی میں تضاد و اختلاف ممکن نہیں۔

(۲) سورۂ آل عمران میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلاً اُولٰٓئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلاَ یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلاَ یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ (آل عمران:۷۷)

''رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا، بل کہ ان کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نہ مجرموں کی طرف دیکھے گا نہ ان سے بات کرے گا تو ان سے حساب کیسے لے گا؟ حساب لینے کے لیے اللہ تعالیٰ کو مجرموں سے مخاطب ہونا ہی پڑے گا۔

جواب: قرآن کریم کسی انسان کا کلام نہیں ہے، بل کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے، اس کی ایک دلیل خود قرآن میں یہ بیان کی گئی ہے:

اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلاَفًا كَثِیْرًا (النساء:۸۲)

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلافِ بیان پاتے۔''

اگر قرآن کریم کے دو بیانات بہ ظاہر ٹکرا رہے ہیں تو یہ کلام الٰہی میں تضاد و اختلاف نہیں، بل کہ انسانی فہم کا تصور ہے۔ کسی آیت کی وہی تفسیر و تاویل قابلِ قبول ہے، جو قرآن کے دیگر بیانات سے نہ ٹکراتی ہو۔ اوپر درج سوال میں مذکور دونوں آیتوں کا جو مطلب لیا گیا ہے وہ چوں کہ قرآن کے دیگر بیانات سے ٹکراتا ہے، اس لیے صحیح نہیں۔

سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ مولانا احمد رضا خاںؒ نے یہ کیا ہے: ''جیسے اس نے تمھارا آغاز کیا ویسے ہی پلٹو گے۔'' یہ لفظی ترجمہ ہے۔ مولانا مودودیؒ نے لفظی ترجمہ نہیں کیا

ہے، بل کہ ان الفاظ میں ترجمانی کی ہے ''جس طرح اس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔'' آپ نے اس ترجمہ سے جو مفہوم اخذ کیا ہے (جس طرح اس نے تمھیں اب یعنی ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا ہے، اسی طرح، یعنی ماؤں کے پیٹ سے، پھر پیدا کیے جاؤ گے) وہ سراسر آپ کے ذہن کی اپج اور الفاظِ قرآنی کے ساتھ کھینچا تانی ہے۔ آیت میں 'کَمَا' حرف تشبیہ ہے اور بلاغت کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں یہ لکھا ہوا ملے گا کہ اگر کسی چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے تو دونوں میں ہر پہلو سے مشابہت ہونا ضروری نہیں۔ کہا جائے: ''زید شیر کی طرح ہے'' تو اس کا یہ مطلب نکالنا درست نہ ہوگا کہ زید شیر کی طرح چار پیروں سے چلتا ہے اور اس کے تیز دانت اور نوکیلے پنجے ہیں، جن سے وہ جانوروں کو پکڑتا اور ان کی تکا بوٹی کر دیتا ہے، بل کہ اس جملہ میں زید کو محض بہادری میں شیر کی طرح کہا گیا ہے۔ اسی طرح آیت میں لفظ 'کَمَا' (جس طرح) سے یہ مطلب نکالنا درست نہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ انسانوں کو ان کی ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا ہے، اسی طرح دوبارہ انھیں ماؤں کے پیٹ سے پیدا کرے گا۔ بل کہ تشبیہ صرف عملِ تخلیق میں ہے نہ کہ کیفیتِ تخلیق میں۔

امام رازیؒ نے حسنؒ اور مجاہدؒ سے یہ تشریح نقل کی ہے: ''اس نے تمھیں دنیا میں پیدا کیا، جب کہ تم کچھ نہ تھے، اسی طرح تم دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے'' (تفسیر کبیر، المکتبۃ التوفیقیۃ مصر، ۱۴/۴۹) علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے: ''جس طرح اس نے شروع میں تمھیں پیدا کیا تھا، اسی طرح دوبارہ (پیدا) کرے گا۔ کفار مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کا انکار کرتے تھے۔ اس آیت میں ان کے خلاف دلیل پیش کی گئی ہے۔ (کشاف، طبع مصر ۱۹۷۲ء، ۲/۷۵-۷۶) یہ مضمون قرآن کریم میں بہ کثرت مقامات پر آیا ہے۔ انسانوں کی دوبارہ تخلیق کو 'مردہ زمین' سے بھی تشبیہ دی گئی ہے، کہ جس طرح زمین پر سبزہ اگتا ہے، پھر وہ مرجھا جاتا ہے اور زمین سوکھ کر چٹیل بن جاتی ہے، دوبارہ پانی ملتا ہے تو وہ پھر پھبک اٹھتی ہے۔ یہ عقلی دلیل بھی دی گئی ہے کہ کسی چیز کو پہلی مرتبہ وجود میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پہلی مرتبہ انسانوں کی تخلیق پر قادر ہو گیا تو دوبارہ اس کا انھیں پیدا کر سکنا کیوں کر ناممکن ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۷۷ پر جو اشکالات وارد کیے گئے ہیں، امام رازیؒ نے ان کے تین جوابات دیے ہیں۔

۱- ان الفاظ سے محض یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے سخت ناراض ہوگا۔ یہ شدتِ غضب کا کنایہ ہے۔ ان الفاظ کا ظاہری مفہوم یہاں مراد نہیں ہے۔

۲- اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے بلا واسطہ بات کرنا ان کے لیے بڑا اعزاز ہوگا، اس لیے اس کے مستحق صرف اس کے نیک بندے ہوں گے۔ رہے کافر و فاسق لوگ، تو ان سے اللہ تعالیٰ بلا واسطہ بات نہیں کرے گا، بل کہ اپنے فرشتوں کے ذریعے ان سے حساب لے گا۔

۳- بات نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے لطف و محبت کی بات نہ کرے گا اور نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان پر کرم و احسان کی نگاہ نہ ڈالے گا۔ آیت میں یہ الفاظ مجازی معنیٰ میں آئے ہیں۔ ان کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر، ۸/ ۹۷-۹۸)

علامہ ابن کثیرؒ نے تیسرے جواب کو اختیار کیا ہے۔ لکھا ہے: ''یعنی اللہ تعالیٰ ان سے محبت سے بات نہ کرے گا اور ان پر رحم و کرم کی نگاہ نہ ڈالے گا۔'' اس مفہوم کی تائید میں انھوں نے متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، مؤسسۃ الریان بیروت، ۲۰۰۷ء، ۱/ ۴۲۱-۴۲۳)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا ہے:

لَا یُکَلِّمُھُمْ۔ یعنی بہ طریق لطف ان سے خطاب نہ کرے گا۔ جو خطاب برائے عتاب و مواخذہ ہو، اس کی نفی مراد نہیں۔

لَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ۔ یعنی نگاہِ مہر و التفات سے ان کی طرف نظر نہ کرے گا، نگاہ قہر کی نفی مراد نہیں۔ (تفسیر ماجدی، طبع لکھنؤ، ۲۰۰۸ء، ۱/ ۵۹۹)

علم غیب کی کنجیاں

سوال: سورۂ لقمان کی آخری آیت میں یُنَزِّلُ الْغَیْثَ (وہی بارش برساتا ہے) کی موجودگی کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ اس آیت میں دوسری جو باتیں مذکور ہیں ان کا تعلق علم اور ادراک سے ہے (عِلْمُ السَّاعَۃِ، یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ، مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ) بارش کا برسانا تو فعل سے تعلق رکھتا

ہے۔ اللہ کی صفات بھی علم اور خبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر اس آیت میں ایک عمل کا ذکر اور وہ بھی علم الساعۃ اور علم الارحام کے درمیان، کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس الجھن کو دور فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب: سورۂ لقمان کی آخری آیت یہ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ وَ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ ۚ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ ؕ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ۝ (لقمان: ۳۴)

''اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے، کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے، اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

اس آیت میں پانچ چیزوں کو بیان کر کے کہا گیا ہے کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، کسی انسان کو ان کی خبر نہیں ہے۔ یہ مضمون متعدد احادیث میں بھی وارد ہوا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَفَاتِیۡحُ الۡغَیۡبِ خَمۡسٌ لاَ یَعۡلَمُهَا اِلَّا اللّٰہُ۔

(صحیح بخاری: ۱۰۳۹، ۴۶۹۷، ۷۳۷۹)

''غیب کی کنجیاں پانچ ہیں۔ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔''

اس حدیث میں آگے انھی پانچ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جو آیت میں مذکور ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے درج بالا جملہ ارشاد فرمانے کے بعد سورۂ لقمان کی زیر بحث آیت کی تلاوت فرمائی۔ (بخاری: ۴۶۹۷، ۴۷۷۸)

حدیثِ جبرئیل میں ہے کہ جب آپؐ سے دریافت کیا گیا: قیامت کب آئے گی؟ تو پہلے آپ نے فرمایا کہ ''جو پوچھ رہا ہے اور جس سے پوچھا جا رہا ہے، دونوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔''

پھر یہ بھی فرمایا:

فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ۔ (بخاری:۴۷۷۷)

''یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم صرف اللہ کو ہے۔''

علماء نے صراحت کی ہے کہ آیت اور حدیث میں پانچ چیزوں کو امورِ غیب میں شمار کیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہی چیزیں غیب ہیں۔ ان میں تمام غیبیات کا احاطہ و استقصاء مقصود نہیں ہے، بل کہ صرف انھی کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیوں کہ یا تو ان کے بارے میں کسی موقع پر سوال کیا گیا تھا، جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، یا یہ ایسی چیزیں ہیں جنھیں جاننے کے لوگ مشتاق رہتے ہیں۔

(فخر الدین الرازی، التفسیر الکبیر، المکتبة التوفیقیة مصر، ۱۴۳/۱۳،ابو حیان الاندلسی، البحر المحیط، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۲۰۰۲ء ۲۵۶/۷،آلوسی، روح المعانی، ادارة الطباعة المنیریة مصر،۱۱۲/۲۱)

مفسرینِ کرام نے اس آیت کے نظم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے لکھا ہے:

''اس سے پہلے کی آیت میں لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس دن سے ڈریں جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ اس دن کا آنا برحق ہے۔ اس پر سننے والا دریافت کرسکتا تھا کہ وہ دن کب آئے گا؟ چناں چہ اس کا بھی جواب دے دیا گیا کہ وہ دن تو آکر رہے گا، لیکن کب آئے گا؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس کے بعد وقوعِ قیامت کی دو دلیلیں دی گئیں: ایک دلیل زمین کا مردہ ہوجانے کے بعد بارش کے نتیجے میں دوبارہ زندہ ہوجانا ہے اور دوسری دلیل انسانوں کی اوّلین تخلیق ہے کہ اگر وہ ممکن ہے تو ان کی از سرِ نو تخلیق کیوں کر محال اور مستبعد ہوسکتی ہے؟! اس کے بعد مخاطبین سے کہا گیا کہ وہ وقتِ قیامت کو جاننے کے کیوں خواہش مند رہتے ہیں، جب کہ انھیں دوسری بہت سی ایسی چیزوں کا علم نہیں ہے، جو ان کے لیے اس سے زیادہ اہم ہیں۔ مثلاً وہ اور ان کی طرح دوسرے انسان نہیں جانتے کہ آئندہ انھیں کیا کچھ کرنے کی توفیق ہوگی اور انھیں خبر نہیں کہ ان کی موت کب اور کہاں آئے گی؟ جب انھیں ایسی چیزوں کا علم نہیں ہے جن سے ان کی ضروریات وابستہ ہیں تو انھیں وقتِ قیامت جاننے کی کیوں خواہش رہتی ہے۔ اس کے سلسلے

میں تو ان کے لیے بس یہ جاننا کافی ہے کہ وہ آ کر رہے گی۔ اور یہ بات پیغمبروں کے ذریعے بتادی گئی ہے۔'' (التفسیر الکبیر، ۱۳/ ۱۴۳، روح المعانی، ۲۱/ ۱۱۱)

اس آیت میں مذکور پانچ چیزوں میں سے چار کا بیان علم وادراک کے صیغوں میں ہے، جب کہ ایک (ینزّل الغیث) کو فعل کے صیغہ (وہی بارش برساتا ہے) میں بیان کیا گیا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب مفسرینِ کرام نے مختلف انداز سے دیا ہے:

۱- پانچوں چیزوں کا تعلق علم سے ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں پانچوں کو امورِ غیب میں شمار کیا گیا ہے اور غیب کا تعلق علم سے ہوتا ہے، نہ کہ عمل سے۔

۲- اس سے مقصود محض خبر دینا نہیں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ہی بارش برساتا ہے'' اس لیے کہ قرآن کے مخاطبین اس کے منکر نہ تھے۔ بل کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ بارش ہونے کے صحیح وقت کا بھی اسی کو علم ہے۔ آیت کا آغاز ''اِنَّ اللّٰهَ عِندَهٗ عِلمُ السَّاعَةِ'' سے ہوا ہے۔ اگلے جملے کا اس پر عطف ہے، اس لیے اس کا مفہوم بھی یہی ہوگا ''عنده علم وقت نزول الغیث''۔

۳- یُنَزِّلُ الغَیثَ کہہ کر بارش برسانے کی قدرت کا اظہار مراد نہیں ہے، بل کہ بارش کے بارے میں ان چیزوں کا بیان ہے جو علم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ کہنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ وہ کب، کہاں اور کتنی مقدار میں پانی برسائے گا؟

۴- جو لوگ شرک فی الربوبیة میں مبتلا ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''فلاں نچھتّر کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔'' حالاں کہ بارش برسانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ امورِ غیب کے بیان کے ساتھ ان لوگوں کے عقیدۂ باطل کا بھی رد ہو جائے، اس مقصد سے 'یعلم' کے بہ جائے 'ینزل' کا لفظ استعمال کیا گیا۔

۵- بارش اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ آیت میں فعل مضارع (ینزّل) لایا گیا، تا کہ اس کی دلالت اس پر ہونے کے ساتھ کہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، اللہ کے انعام واحسان پر بھی ہو جائے۔

۶- قرآن میں دیگر مقامات پر بارش کے نتیجے میں روئے زمین پر دوبارہ روئیدگی کے عمل

سے وقوع قیامت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس آیت میں 'یعلم الغیث' کے بہ جائے ینزّل الغیث کہا گیا، تاکہ علم الٰہی میں اس کے شامل ہونے کے ساتھ اس استدلال کی طرف بھی اشارہ ہو جائے۔

(ان نکات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے روح المعانی، ۲۱/۱۰۹، الشیخ محمد الطاهر بن عاشور، تفسیر التحریر والتنویر، دار سحنون للنشر والتوزیع تیونس، جزء۲۱، ص۱۹۷)

اس آیت میں بلاغت کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے چند کی طرف مختصر اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱- ان اللّٰہ یعلم الساعة کے بہ جائے اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلمُ السَّاعَةِ کہا گیا ہے۔ لفظ 'عند' کے استعمال سے اختصاص وحصر کے معنیٰ پیدا ہو گئے ہیں۔ یعنی قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اور کسی کو نہیں ہے۔

۲- علم الساعة سے پہلے لفظ 'عند' لایا گیا ہے۔ اور عند اللّٰہ کہنے کے بہ جائے پہلے لفظ 'اللّٰہ' لایا گیا، اس کے بعد ضمیر کا استعمال کر کے 'عندہ' کہا گیا ہے۔ یہ انداز بھی اختصاص کے معنیٰ پیدا کرتا ہے۔

۳- دوسرے جملے میں مصدر (عِلم) لانے کے بہ جائے فعل مضارع (یَعلَمُ) لایا گیا ہے، جو فعل کی تکرار کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی رحم میں جنین جتنے مراحل سے گزرتا ہے اور جن کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، ان سب کا اللہ تعالیٰ کو علم رہتا ہے۔

۴- تیسرے جملے میں بھی فعل مضارع (ینزّل) لایا گیا ہے۔ اس سے فعل کی تکرار کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

۵- چوتھے اور پانچویں جملے میں دو چیزوں کے تعلق سے کہا گیا ہے کہ ان کا کسی انسان کو علم نہیں ہے۔ اس سے بہ طور کنایہ ثابت ہوتا ہے کہ ان چیزوں کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

۶- ان دونوں جملوں میں علم کے بہ جائے درایة کے مادہ سے لفظ (تَدرِی) استعمال کیا گیا ہے۔ درایة کا معنیٰ علم سے کچھ مختلف ہے۔ اس (درایة) میں معلومات حاصل کرنے

کے لیے کوشش کرنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لیے درایۃ کے مادہ سے کسی لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کیا جاتا۔

۷۔ آخری جملے (اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ) کے ذریعے یہ کہنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم صرف انھی پانچ چیزوں تک محدود نہیں ہے، بل کہ وہ مطلق علیم ہے، اسے کائنات کی ہر چیز کا علم ہے اور 'خبیر' کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ اسے اشیاء کے صرف ظاہر کا ہی علم نہیں ہے، بل کہ اس کا علم ان کے باطن تک پہنچا ہوا ہے۔

اس آیت میں بلاغت و معانی کے اور بھی بہت سے نکتے ہیں، جن کی طرف مفسرین کرام نے اشارہ کیا ہے۔ تفصیل کے طالب ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

قصصِ یوسفؑ و سلیمانؑ کے بعض اشکالات

سوال: آج کل مولانا مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن میرے زیر مطالعہ ہے۔ مطالعے کے دوران سورۂ یوسف اور سورۂ نمل سے متعلق کچھ سوالات ذہن میں ابھرے ہیں۔ بہ راہِ کرم ان کا تحقیقی، مدلل اور تشفی بخش جواب مرحمت فرمایے۔ نوازش ہوگی۔

(۱) سورۂ یوسف کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے: ''جب یوسف اپنے بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں خود پیالہ رکھوا دیا اور پھر چوری کے الزام میں اسے اپنے پاس روک لیا۔'' کیا یہ جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں ہوا؟ کیا ایک شخص نبی ہوتے ہوئے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس بات کو سرسری طور پر نہ لیں۔ کیوں کہ ہم ایک نبی پر ایمان ہی اس بنیاد پر لاتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں کسی معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

(۲) سورۂ نمل میں ہے کہ ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کا شاہی تخت، اس وقت جب وہ اپنے محل میں موجود نہیں تھی، اٹھوا کر اپنے یہاں منگوا لیا۔'' اس فعل کو آپ کیوں کر جائز ٹھہرائیں گے؟ بھلا بتایے، اگر آپ اپنے گھر میں موجود نہ ہوں اور کوئی شخص آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے گھر سے آپ کا سامان اٹھا لے جائے تو آپ اس عمل کو کیا کہیں گے؟

جواب: آپ کے دونوں سوالات آیاتِ قرآنی کی تاویل وتوجیہہ سے متعلق ہیں۔ میں اپنے فہم کے مطابق انھیں حل کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

(۱) سورۂ یوسف کی متعلقہ آیات کی جو تشریح و تفسیر عام طور سے مفسرین کرام نے کی ہے، اس سے وہ اشکال پیدا ہونا فطری ہے، جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا 'توریہ' قرار دیا ہے۔ توریہ اسے کہتے ہیں کہ ایک شخص کوئی ایسی بات کہے، جو ظاہر میں خلافِ واقعہ معلوم ہو، لیکن حقیقت میں وہ واقعے کے عین مطابق ہو۔ مولانا مودودیؒ کی تشریح بھی دوسرے مفسرین کے مطابق ہے۔ مفسرین نے واقعے کی جو جزئیات بیان کی ہیں، ان پر متعدد اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور الفاظِ قرآنی سے بھی ان کی تائید نہیں ہوتی ہے۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روکنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک اسکیم تیار کی اور کام یابی کے ساتھ اس پر عمل کیا۔ جب کہ قرآن مجید اس خفیہ تدبیر کو حضرت یوسفؑ کی طرف نہیں، بل کہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی)

(۲) وہ کہتے ہیں کہ بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی حضرت یوسف علیہ السلام نے خود لی اور چوں کہ انھیں معلوم تھا کہ گم شدہ پیالہ ان کے بھائی بنیامین کے تھیلے میں ہے، اس لیے کہ انھوں نے اسے خود رکھا یا رکھوایا تھا، اس لیے پہلے دوسرے بھائیوں کے تھیلے کھول کر دیکھے اور سب سے آخر میں بنیامین کا تھیلا کھولا اور اس میں سے پیالہ نکال کر اس پر چوری کا الزام لگا دیا۔ جب کہ قرآن مجید میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ فَبَدَأَ بِاَوْعِيَتِهِمْ (تب اس نے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینی شروع کی) میں ضمیر کا مرجع مُؤَذِّنٌ (پکارنے والے) کی طرف بھی ہوسکتا ہے، بل کہ وہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ وہی قریب ترین اسم ظاہر ہے۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے سامان میں سِقَايَة (پانی پینے کا برتن، پیالہ) رکھا تھا، جب کہ سرکاری کارندوں نے بتایا کہ صُوَاع (ناپنے کا برتن، پیمانہ

غائب ہو گیا ہے۔ دونوں موقعوں کے لیے قرآن میں الگ الگ الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن مفسرین نے دونوں کو ایک کر دیا اور تاویل یہ کی کہ اس برتن کو پہلے پانی پینے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، بعد میں اسی کو ناپنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ بات نہ عقلی طور پر ہضم ہوتی ہے اور نہ الفاظ قرآنی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ایک بڑی مملکت کے سربراہ تھے۔ قحط کے زمانے میں اطراف و اکناف کے ہزاروں ضرورت مندوں کو غلّہ سپلائی کیا جا رہا تھا۔ اس لیے یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ غلّہ ناپنے کے لیے سرکاری طور پر متعین کردہ کوئی پیمانہ نہ ہو، بل کہ پانی پینے والے ایک کٹورے ہی سے غلّہ ناپ ناپ کر دیا جاتا ہو۔ سِقَایَۃ عربی زبان میں اس برتن کو کہتے ہیں، جسے پانی پینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مؤنث ہے اور صواع کا اطلاق اس برتن پر ہوتا ہے، جسے ناپنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مذکر ہے۔ اسی معنی میں لفظ صاع بھی مستعمل ہے۔ آگے کی آیات میں صواع کے لیے مذکر کی ضمیر (وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ) اور سقایۃ کے لیے مؤنث کی ضمیر (ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا) آئی ہے۔ سرکاری کارندوں کے بیان کے مطابق ان کا صواع غائب ہوا تھا، لیکن بنیامین کے تھیلے سے صواع نہیں، بل کہ سقایۃ نکلا تھا۔

قرآنی بیانات پر غور کرنے سے پیش آمدہ واقعات کی درج ذیل ترتیب سمجھ میں آتی ہے:

۱- حضرت یوسف علیہ السلام کے اصرار پر جب ان کے بھائی اگلے سفر میں ان کے ماں جائے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لائے تو حضرت یوسفؑ نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا، ان کی خوب خاطر مدارات کی اور ان پر ظاہر کر دیا کہ میں ہی تمھارا وہ بھائی ہوں، جو کھو گیا تھا اور انھیں تسلّی دی کہ وہ بھائیوں کے جور و ستم پر دل گرفتہ نہ ہوں۔ اس موقع پر اگرچہ حضرت یوسفؑ کی دلی خواہش تھی کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیں، لیکن وہ مصلحتاً ابھی اپنے دوسرے بھائیوں پر خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بنیامین کو بھائیوں کے ساتھ واپس جانے دیا۔ کیوں کہ بغیر خود کو ظاہر کیے انھیں اپنے پاس روکنا ممکن نہ تھا۔

۲- بھائیوں کے قافلے کی واپسی کے وقت انھوں نے ایک پیالہ اپنے بھائی بنیامین کے سامان میں رکھوا دیا، تاکہ طویل سفر کے دوران راستے میں پانی پینے کے لیے اسے استعمال کیا جا سکے۔ اس کی خبر صرف حضرت یوسفؑ کو تھی یا اس شخص کو جس کے ذریعے انھوں نے اسے رکھوایا تھا۔ بنیامین کو بھی بتانے کی انھوں نے ضرورت نہیں سمجھی کہ راستے میں جب وہ اپنے سامان میں اسے دیکھے گا تو سمجھ جائے گا کہ بھائی نے دیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کا یہ عمل اسی طرح کا تھا، جس طرح انھوں نے اپنے بھائیوں کے پہلے سفر میں ان کی نقدی کو (جو انھوں نے غلّہ کے عوض دی تھی) ان کے سامان میں رکھوا دیا تھا اور سامان کھولنے پر جب انھوں نے اپنی نقدی دیکھی تھی تو سمجھ گئے تھے کہ یہ 'عزیز مصر' کی نوازش ہے۔

۳- برادرانِ یوسف کے قافلے کے رخصت ہونے کے بعد وہ سرکاری پیمانہ، جس سے غلّہ ناپا جاتا تھا، کہیں کھو گیا۔ کارندے پریشان ہوئے کہ دوسرے قافلے آتے ہوں گے، انھیں کیسے غلّہ ناپ کر دیا جائے گا؟ معاً ان کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ابھی یہاں سے گئے ہیں وہی اٹھا لے گئے ہوں۔ فوراً ان کے پیچھے کچھ لوگوں کو دوڑایا گیا۔

۴- ارکانِ قافلہ اور سرکاری کارندوں کے درمیان دو بہ دو ہونے والی جو گفتگو قرآن نے نقل کی ہے، اس سے سرکاری کارندوں کی پریشانی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا غالب گمان تھا کہ اسے انھی قافلہ والوں میں سے کسی نے غائب کیا ہے۔ انھوں نے پیمانے کو برآمد کرنے کے لیے لالچ سے بھی کام لیا اور دھمکایا بھی۔ لالچ یہ دیا کہ ''جو شخص بھی اسے لا کر دے گا اس ایک شتر غلّہ انعام دیا جائے گا۔ اس کا پکّا وعدہ ہے'' جب ارکانِ قافلہ نے اپنی برأت ظاہر کی تو دھمکی آمیز لہجے میں دریافت کیا کہ اگر کسی کے سامان میں سے نکل آیا تو اس کی کیا سزا ہوگی؟

۵- جرائم کی سزائیں ہر ملک میں متعین ہوتی ہیں۔ کسی ملک میں جس جرم کا ارتکاب ہوتا ہے، اس کی سزا اس ملک کے قوانین کے مطابق دی جاتی ہے۔ چوری کی جو سزا اس زمانے میں مصر میں دی جاتی تھی، اسی کے مطابق معاملہ کیا جاتا، لیکن سرکاری ملازموں

نے خلافِ معمول خود مشتبہ ملزموں سے اس کی سزا پوچھی۔ انھوں نے کہا: ''اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں سے وہ غائب چیز نکلے اسے روک لیا جائے۔'' یہی ہے وہ 'تدبیر' جو اللہ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں ظاہر ہوئی تھی۔ آگے کی آیت کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ (اس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی) سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔

۶- برادرانِ یوسف کے تھیلوں کی تلاشی سرکاری کارندوں کے اسی سرغنہ نے لی، جسے گزشتہ آیت میں مؤذن (پکارنے والا) کہا گیا تھا۔ پہلے حضرت یوسفؑ کے دوسرے بھائیوں کے تھیلوں کی اور آخر میں بنیامین کے تھیلے کی تلاشی لینا محض اتفاقیہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ تلاشی لینے والے کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس تھیلے میں پیالہ رکھا ہوا ہے، اس لیے جان بوجھ کر اس نے اس کی تلاشی سب سے آخر میں لی۔

۷- تلاشی لینے پر کھویا ہوا پیمانہ (صواع) تو برآمد نہ ہوا، لیکن ایک دوسری چیز (سقایة) مل گئی۔ چناں چہ ارکان قافلہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کے سامنے پوری تفصیل بتائی گئی کہ سرکاری پیمانہ کہیں کھو گیا تھا، ان لوگوں پر شبہ ہوا، ان کی تلاشی لینے پر پیمانہ تو نہیں ملا، البتہ یہ پیالہ ان کے سامان میں ملا ہے۔ حضرت یوسفؑ کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان لوگوں سے پوچھا گیا تھا کہ اگر کھوئی ہوئی چیز ان کے سامان میں مل گئی تو اس کی کیا سزا ہوگی؟ انھوں نے کہا تھا کہ جس کے سامان میں سے وہ چیز نکل آئے اسے روک لیا جائے۔

۸- بنیامین کے سامان میں پیالہ نکل آیا تو برادرانِ یوسفؑ کھسیا گئے۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے وہ فوراً بول پڑے: ''یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے۔'' اس کے بعد قرآن کہتا ہے: فَاَسَرَّھَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِھَا لَھُمْ (آیت:۷۷) (یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا، حقیقت ان پر نہ کھولی)۔ مفسرین نے عام طور پر اس جملے کو پہلے جملے سے متعلق مانا ہے، یعنی بھائیوں نے جب چوری کے معاملے میں بنیامین کے ساتھ یوسفؑ کو بھی لپیٹ لیا تو یوسفؑ کو غصّہ تو بہت آیا، مگر وہ اسے پی گئے اور کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس سے

حقیقت ظاہر ہوجائے۔ لیکن صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا تعلق پورے واقعے سے ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب ان کے بھائیوں کا مقدمہ آیا تو اگرچہ انھیں بہ خوبی معلوم تھا کہ پیالے (سقایة) کی چوری بنیامین نے نہیں کی ہے، اسے تو انھوں نے خود رکھوایا تھا، لیکن وہ خاموش رہے اور بھائیوں کے سامنے حقیقت حال کا اظہار نہیں کیا۔ اس لیے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ مشیتِ الٰہی سے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کی ایک سبیل نکل آئی ہے، جس پر ان کے بھائی بھی چار و ناچار تیار ہیں۔ اسی لیے جب ان کے بھائیوں نے منت سماجت کی کہ بنیامین کو چھوڑ دیجیے اور اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجیے تو حضرت یوسفؑ اس پر تیار نہیں ہوئے اور کہا کہ اسی کو روکیں گے، جس کے پاس اپنا سامان پایا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوجاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے نہ اپنے بھائی پر چوری کا الزام لگایا اور نہ کسی موقعے پر دروغ گوئی سے کام لیا۔ بل کہ واقعات مشیت الٰہی سے خود بہ خود حضرت یوسفؑ کے حق میں سازگار ہوتے گئے۔

قصۂ یوسف کی جو تاویل اوپر کی سطروں میں بیان کی گئی ہے، وہ میرے ذہن کی اپج نہیں ہے، بل کہ بعض قدیم اور جدید مفسرین نے اس کی جانب اشارے کیے ہیں۔ مشہور مفسر امام رازیؒ نے پہلے یہ اشکال قائم کیا ہے: ''اگر یہ کہا جائے کہ جو کچھ کیا گیا اس کا حضرت یوسفؑ نے حکم دیا تھا یا اس کی انجام دہی بغیر ان کے حکم کے کی گئی تھی؟ اگر وہ ان کے حکم سے ہوا تھا تو یہ ایک پیغمبر برحق کے شایانِ شان کیوں کر ہوسکتا ہے کہ وہ غلط طور سے کچھ لوگوں پر الزام لگائے، انھیں چور کہے، ان کے بارے میں جھوٹ بولے اور ان پر بہتان لگائے؟ اور اگر دوسری بات ہے، یعنی انھوں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا تو انھوں نے کیوں ان پر لگائے جانے والے الزام کی تردید نہیں کی اور کیوں اس سے ان کی برأت کا اظہار نہیں کیا؟'' پھر اس اشکال کے جواب میں انھوں نے علماء کی چار توجیہیں نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک توجیہ یہ ہے کہ قرآن میں یہ مذکور نہیں ہے کہ سرکاری ملازموں نے حضرت یوسفؑ کے کہنے پر چوری کا الزام لگایا تھا۔'' (التفسیر الکبیر، المکتبة لقو التوفیقیة، قاهره، ۱۸/ ۱۴۷) مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے مذکورہ آیات کی یہی

تاویل اختیار کی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے مولانا جلیل احسن ندوی، نقوش وتاثرات، دائرہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ، مقدمہ) یہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ ان کی اپنی رائے تھی یا ان کے استاذ مولانا فراہیؒ کی رائے سے استفادہ تھا۔

(۲) قصہ سلیمانؑ وملکۂ سبا کے بارے میں جو اشکال آپ نے ظاہر کیا ہے، وہ بھی واقعہ کے سیاق وسباق سے ہٹ کر اس پر غور کرنے کا نتیجہ ہے۔ کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا دارومدار اس کے موقع ومحل پر ہوتا ہے۔ عام حالات میں ایک عمل ناجائز ہوتا ہے، مگر وہی عمل بعض مخصوص حالات میں جائز ہوجاتا ہے۔ ان مخصوص حالات میں سے ایک حالت جنگ کی ہے۔ مثال کے طور پر عام حالات میں کسی شخص کو قتل کرنا اور اس کی مملوکہ چیزوں پر قبضہ کرنا جائز نہیں، مگر حالتِ جنگ میں دشمن کے تعلق سے یہ دونوں کام جائز ہوجاتے ہیں۔ عام حالات میں پڑوسی مملکتوں کی زمینوں اور جائیدادوں پر تسلط جمانا جائز نہیں، مگر حالتِ جنگ میں اس کی اجازت ہے۔ مذکورہ واقعے میں حضرت سلیمانؑ کے ذریعے ملکۂ سبا کا تختِ شاہی اٹھوا لینا عام حالات کا نہیں، بل کہ حالتِ جنگ کا واقعہ ہے۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔ قرآنی بیان کے مطابق واقعات کی ترتیب درج ذیل ہے:

۱- مملکتِ سبا میں جو قوم بستی تھی، وہ سیدھے راستے سے بھٹکی ہوئی تھی، سورج کی پرستش کرتی تھی، اللہ کو بھولی ہوئی تھی، شیطان کے بہکاوے میں آکر گندے اور غلط کاموں میں مبتلا تھی: وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (النمل:۲۴)

ان پر ایک عورت حکم رانی کررہی تھی، وہ بھی گم راہی اور شرک وبت پرستی میں اپنی قوم کے ساتھ شریک تھی: وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝ (النمل:۴۳)

۲- حضرت سلیمان علیہ السلام نے انھیں سرکشی کی روش سے باز آنے اور سرِ اطاعت خم کرنے کی دعوت دی: اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ (النمل:۳۱)

۳- ملکۂ سبا نے حضرت سلیمانؑ کا پیغام ملنے کے بعد اپنے درباریوں اور مملکت کے اعیان ووزراء سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم زور آور اور جنگ جو لوگ ہیں، جنگ کیے بغیر اطاعت نہیں کریں گے: نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ (النمل:۳۳)

۴- ملکہ نے جنگ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے مصالحانہ روش اختیار کرنے کو ترجیح دی اور حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں تحائف بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا: اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ (النمل:۳۵)

۵- حضرت سلیمانؑ نے تحائف قبول نہیں کیے اور فرمایا کہ انھیں اسلام یا اطاعت کے علاوہ اور کوئی چیز منظور نہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے تحائف لانے والے وفد کو واپس کرتے ہوئے جنگ کا اعلان کر دیا: اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَ لَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ٥ (النمل:۳۷)

ملکہ کا تخت شاہی منگوانے کا واقعہ اس کے بعد کا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اس کا تعلق عام حالات سے نہیں، بل کہ حالتِ جنگ سے ہے۔

واقعے کے سیاق میں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ملکہ کا تخت شاہی اٹھوا کر حضرت سلیمانؑ نے کیا مقصد حاصل کرنا چاہا تھا؟ اور کیا اس میں کام یاب ہوئے؟ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس تخت کی تعریف سن کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور وہ اسے اپنے یہاں اٹھوا کر خود استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اگر ان میں کسی طرح کا لالچ ہوتا تو وہ ملکہ کی جانب سے بھیجے گئے قیمتی تحائف کو واپس نہ کرتے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو نعمتیں حاصل تھیں، وہ ملکۂ سبا کو حاصل آسائشوں سے کہیں بڑھ کر تھیں: فَمَآ اٰتٰنِیَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰكُمْ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے شیش محل کو دیکھ کر ملکہ مبہوت ہو کر رہ گئی اور اس کے انتہائی صاف وشفاف اور بلّوریں فرش کو پانی کا حوض سمجھ بیٹھی۔ ملکہ کے تخت شاہی کو آناً فاناً اس کے دربارِ سلیمانی میں پہنچنے سے پہلے منگوانے کی اصل غرض یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی طاقتوں کا ایسا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے، جسے دیکھ کر وہ محض مطیع اور باج گزار بن کر نہ رہ جائے، بل کہ نعمتِ ایمانی سے بہرہ ور ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ ملکہ کے پہنچنے پر اس کا تخت بالکل انجان بن کر اسے دکھایا گیا تو وہ

فوراً پہچان گئی کہ یہ تو اسی کا تخت ہے۔ اس حیرت انگیز مظاہرے نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ ایمان جو حضرت سلیمانؑ کی پہلی دعوت پر اسے اپنی رمق دکھا گیا تھا، اس کے دل میں پوری طرح جاگزیں ہو گیا۔ چناں چہ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا یہ آپ کا تخت ہے؟ تو وہ بول پڑی: ''كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ (النمل:۴۲)'' یہ تو گویا وہی ہے۔ ہم تم پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سرِ اطاعت جھکا دیا تھا۔'' پھر جب اس نے شیش محل کی حیرت انگیز تعمیر کا مشاہدہ کیا تو بے اختیار اپنے قبول اسلام کا اعلان کر دیا: قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ۧ (النمل:۴۴)

مولانا مودودیؒ نے اس واقعے کے سلسلے کے بعض اشکالات کا جواب اپنے ایک مضمون میں دیا ہے، اسے تفہیمات، جلد دوم (ص:۵۹-۷۱) میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

بائبل کے مشتملات

سوال: تفہیم القرآن جلد دوم، سورۂ توبہ، حاشیہ ۲۹، صفحہ ۱۴۹ ملاحظہ ہو۔

''عزیر سے مراد عزرا (Ezra) ہیں، جنھیں یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں۔ ان کا زمانہ ۴۵۰ قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ انھیں عزیر یا عزرا نے بائبل کے پرانے عہد نامے کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عزیر کا زمانہ ۴۵۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے تو آخر انھوں نے بائبل کے کون سے پرانے عہد نامے کو مرتب کیا، جب کہ بائبل (انجیل) تو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی ہے؟

جواب: آپ کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے بائبل کو انجیل کا ہم معنیٰ سمجھ لیا، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ بائبل، جسے اردو میں 'کتاب مقدس' بھی کہتے ہیں، اصلاً دو مجموعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مجموعے کو 'پرانا عہد نامہ' (Old Testament) اور دوسرے مجموعے کو 'نیا عہد نامہ' (New Testament) کہا جاتا ہے۔ پرانا عہد نامہ ۳۹ کتابوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ابتدائی پانچ کتابیں 'توریت' کہلاتی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: کتاب پیدائش، کتاب

خروج، کتاب احبار، کتاب گنتی اور کتاب استثناء۔ نیا عہد نامہ ۲۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ابتدائی چار کتابوں میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے: متی کی انجیل، مرقس کی انجیل، لوقا کی انجیل اور یوحنا کی انجیل۔

اس وقت جو کتابیں توریت یا انجیل کے نام سے پائی جاتی ہیں وہ بعینہ وہی کتابیں نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ بل کہ انھیں بہت بعد میں مرتب کیا گیا ہے۔ البتہ ان میں اصلی توریت اور اصلی انجیل کے بہت سے اجزاء اب بھی پائے جاتے ہیں۔ بائبل کا پرانا عہد نامہ متعدد مرتبہ حوادثِ زمانہ کی نذر ہوا اور اس کے تمام نسخے ضائع ہو گئے۔ حضرت عزیر نے انھیں اپنی یادداشت سے از سرِ نو مرتب کیا۔ اسی اہم خدمت کی بنا پر یہود انھیں اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں اور ان کے بہت احسان مند ہیں۔

کیا رسول اللہ ﷺ کا مشن لوگوں کو بہ جبر مسلمان بنانا تھا؟

سوال: ذیل میں صحیح مسلم کی ایک حدیث درج کر رہا ہوں، اس کا ظاہری مفہوم مجھے اسلام کی مجموعی تعلیمات سے ٹکراتا ہوا محسوس ہو رہا ہے:

> ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ یہ شرائط تسلیم کرلیں تو ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں گے۔ الا یہ کہ وہ ان سے متعلق کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم کر دیے جائیں، رہا ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمّے ہے۔“ (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۲۹)

اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا تھا کہ آپؐ جہاد و قتال کے ذریعے مشرکین کو مسلمان بنائیں۔ اس کی تشریح میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اتمام حجت کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ جو مشرکینِ عرب اسلام قبول نہ کریں انھیں قتل کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں اسلام دشمن عناصر کے اس الزام کا جواب کس طرح دیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے اوّلین اور اہم ترین دور میں ہی اسلام کو بہ زور شمشیر پھیلانے کا حکم دیا گیا تھا اور پیغمبرِ

اسلام نے جنگ اور قتال کے ذریعے مشرکین کو مسلمان بنایا تھا؟ اس سلسلے کی چند قابل غور باتیں یہ بھی ہیں:

(۱) کیا دور نبوی میں مذکور حدیث کے حکم کے مطابق کوئی جہاد کیا گیا تھا، جس میں مشرکین کو جہاد (بہ معنی قتال) کے ذریعے مسلمان بنایا گیا ہو؟

(۲) کیا فتح مکہ کے بعد تمام مشرکین نے اسلام قبول کر لیا تھا؟ اور جو دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے، وہ سب قتل کر دیے گئے تھے؟

(۳) کیا تاریخ وسیرت کی کتابوں میں ان صحابۂ کرام کے نام ملتے ہیں، جنھوں نے تلوار کی نوک پر اور موت کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا؟

(۴) فتح مکہ کے بعد مشرکین عرب کے سلسلے میں حضورؐ کو دو احکام دیے گئے۔ ایک یہ کہ انھیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے اور دوسرے یہ کہ وہ آئندہ سال کعبۃ اللہ کے پاس نہ آنے پائیں۔ اگر اسلام قبول نہ کرنے والے مشرکین کو قتل کر دینے کا حکم تھا تو پھر انھیں جزیرۃ العرب سے نکال دینے اور کعبۃ اللہ کے پاس نہ آنے دینے کا کیا مطلب ہے؟

اس حدیث کے آخری الفاظ ہیں: وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (رہا ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمّے ہے) اس کا کیا مطلب ہے؟

قرآن کریم کی بہ کثرت آیات میں کہا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں، جو چاہے قبول کرے جو چاہے نہ قبول کرے۔ پیغمبر کی شدید خواہش رہتی تھی کہ آپ جو دعوت پیش کر رہے ہیں، اسے زیادہ سے زیادہ لوگ قبول کر لیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو تنبیہ کی گئی کہ آپؐ کا کام صرف دعوت پہنچا دینا ہے، اسے کون قبول کرتا ہے اور کون نہیں قبول کرتا، اس سے آپ کو غرض نہیں۔ ان آیات اور درج بالا حدیث میں تضاد اور اختلاف نظر آ رہا ہے۔ دونوں میں کس طرح تطبیق دی جائے گی؟ بہ راہ مہربانی اس کا صحیح مفہوم واضح کیجیے۔

جواب: اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(۱) سوال میں جو حدیث نقل کی گئی ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے اور اس کی تخریج امام مسلمؒ نے کی ہے۔ الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ اسے حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی تخریج صحاح ستہ، مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کا مضمون دوسری بہت سی صحیح اور مستند حدیثوں سے ثابت ہے۔ اس میں کسی اعتبار سے شک وشبہ کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔

(۲) جو مضمون اس حدیث میں مذکور ہے، وہی قرآن کریم کی بہت سی آیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ (التوبۃ:۵)

”تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔“

وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (التوبۃ:۳۶)

”اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔“

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ (التوبۃ:۱۲۳)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمھارے پاس ہیں، اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں۔“

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (الانفال:۳۹)

’’اوران (کافروں) سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث پر جو عنوان (ترجمۃ الباب) قائم کیا ہے، اس میں سورۂ توبہ کی مذکور بالا پانچویں آیت کو شامل کیا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فَاِنْ تَابُوا وَ اَقَامُوا الصَّلاۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکَاۃَ فَخَلُّوا سَبِیْلَھُمْ) اس کی تشریح کرتے ہوئے شارح بخاری حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

’’امام بخاریؒ نے اس حدیث کو سورہ التوبہ کی آیت ۵ کی تفسیر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ آیت میں توبہ کرنے سے مراد کفر کی روش ترک کر کے توحید کو اختیار کر لینا ہے۔ آیت اور حدیث میں ایک دوسری مناسبت یہ ہے کہ آیت میں کہا گیا ہے ’’تو انھیں چھوڑ دو‘‘ اور حدیث میں ہے ’’تو ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں گے‘‘ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔‘‘

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ بیروت، ۱/ ۷۵)

یہی تشریح دوسرے شارح بخاری علامہ بدرالدین عینیؒ نے بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

’’جس طرح آیت میں کہا گیا ہے کہ جو شخص یہ کام کرنے لگے، اسے چھوڑ دیا جائے، اسی طرح حدیث میں مذکور ہے کہ جو شخص یہ کام کرنے لگے اس کی جان اور مال محفوظ ہو جائیں گے۔ دونوں باتوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ اسی مناسبت سے امام بخاریؒ نے آیت اور حدیث کو یکجا ذکر کیا ہے‘‘ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، طبع مصر، ۱/ ۲۰۳)

آگے لکھتے ہیں:

’’حدیث کا مفہوم آیت کے مفہوم کے عین مطابق ہے، اسی لیے امام بخاری نے حدیث کے ساتھ آیت کو ذکر کیا ہے۔‘‘ (حوالہ سابق، ۱/ ۲۰۴)

موجودہ دور کے عظیم مصلح اور مفسر قرآن علامہ سید محمد رشید رضا نے لکھا ہے:

’’یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ الفاظ حدیث سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیان کردہ حکم تمام کفار سے قتال کے تعلق سے مطلق اور عام ہے، جب کہ آیت میں بیان کردہ حکم صرف مشرکین

کے تعلق سے ہے۔ قابلِ ترجیح یہ ہے کہ حدیث کو آیت پر محمول کیا جائے، تاکہ اس کا مفہوم صحیح اور محکم رہے۔ امام بخاری کی فقہ اور نکتہ رسی کا اظہار ان ابواب سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب کی احادیث پر قائم کیے ہیں۔ انھوں نے کتاب الایمان کے ایک باب میں اس حدیث کو سورہ التوبہ کی آیت ۵ کے ذیل میں نقل کیا ہے۔'' (تفسیر المنار، طبع مصر، ۱۰/ ۱۷۲)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اس حدیث کا مفہوم سورۂ توبہ کی آیتِ مذکور کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) قرآن کریم میں وارد آیاتِ قتال کا مطالعہ ان کے زمانۂ نزول کے پس منظر میں کرنا چاہیے۔ یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو عموماً ان آیات کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔

اسلام آزادیِ فکر وعقیدہ کا علمبردار ہے۔ وہ کسی پر زور زبردستی اور جبر وکراہ کے ذریعے اپنے خیالات مسلّط نہیں کرتا، بل کہ اسے ناروا ظلم قرار دیتا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے اپنے اس بنیادی حق کو استعمال کرتے ہوئے اسلام قبول کیا، مشرکین مکہ ان کے جانی دشمن بن گئے، ان کو طرح طرح سے ستایا اور ان پر مصائب وآلام کے پہاڑ توڑے۔ ان زہرہ گداز حالات سے بچنے کے لیے انھیں اپنا گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑا اور پہلے حبشہ، پھر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ اس کے باوجود مشرکین نے انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور وقتاً فوقتاً ان کے خلاف جنگ برپا کرتے رہے اور انھیں بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی تدبیریں کرتے رہے۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ جو لوگ تمھاری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور برابر تم سے جنگ برپا کیے ہوئے ہیں تم بھی ان سے جنگ کرو اور ان کی سرکوبی کرنے اور ان کا زور توڑ دینے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرو۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن کریم نے مشرکین عرب کو بہ راہ راست خطاب کیا ہے۔ انھیں توحید کی دعوت دی ہے اور ان کے سامنے شرک کے خلاف دلائل قائم کیے ہیں۔ ان کے درمیان اللہ کے رسول ﷺ کی ذات گرامی بہ نفس نفیس موجود تھی۔ آپ نے ہر پہلو سے ان کے سامنے کلمۂ حق پیش کیا اور انھیں شرک سے روکا۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل عرصہ گزر گیا اور

ان پر حجت تمام ہوگئی تو اعلان کر دیا گیا کہ اب مرکز اسلام میں صرف توحید کا بول بالا ہوگا، کسی کو ہرگز شرک پر قائم رہنے کی اجازت نہ ہوگی۔

قرآن کریم میں مذکور آیاتِ قتال عموماً حالتِ جنگ سے بحث کرتی ہیں۔ جب جنگ برپا ہو اس وقت نرمی دکھانا اور دشمن پر وار کرنے میں پس وپیش کرنا خود کو موت کے منہ میں ڈھکیلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ کسی کی جان لینا یقیناً برا ہے، لیکن 'فتنہ' اس سے زیادہ برا ہے اور فتنہ یہ ہے کہ کسی کو اس کی پسند کا عقیدہ قبول کرنے کی آزادی نہ دی جائے اور اس کی وجہ سے اس پر ظلم وستم روا رکھا جائے۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ مشرکین یہی فتنہ برپا کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان سے اس وقت تک جنگ کرتے رہو جب تک کہ یہ فتنہ فرو نہ ہو جائے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جنگ کے یہ احکام مشرکین عرب کے ساتھ خاص تھے اور ان کا ایک مخصوص پس منظر ہے۔ انھیں تمام غیر مسلموں سے متعلق عام اور مطلق قرار دینا صحیح نہیں۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

''سورہ برأۃ (توبہ) کی یہ آیت (نمبر ۵) مشرکین مکہ اور دیگر اہل عرب کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے مسلمانوں سے کیے گئے عہد کو توڑا تھا۔''

(عمدۃ القاری، ۱/ ۲۰۳)

علامہ رشید رضا نے لکھا ہے:

''یہ بات متفق علیہ ہے کہ قرآن میں مشرکین اور اہل کتاب کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ یہ آیت (التوبۃ: ۵) مشرکین عرب سے متعلق ہے، جنھوں نے معاہدوں کی پابندی نہیں کی، اس لیے انھیں منسوخ کر دیا گیا۔ ان آیات میں مشرکین عرب سے جنگ کرنے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا کہ انھوں نے ہی مسلمانوں سے جنگ کا آغاز کیا تھا اور ان سے کیے گئے معاہدوں کو توڑا تھا، جیسا کہ آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''کیا تم نہ لڑوگے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنھوں نے رسولؐ کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے'' (التوبۃ: ۱۳) ان سے جنگ کرنے کا حکم 'جیسے کو تیسا' کے اصول پر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو، جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔'' (التوبۃ: ۳۶) (تفسیر المنار: ۱۰/ ۱۶۷-۱۶۸)

حدیث میں بھی اگر چہ الفاظ عام ہیں، لیکن مراد مشرکین عرب ہی ہیں۔ امام نوویؒ شارح صحیح مسلم نے قاضی عیاضؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''اس سے مراد مشرکین عرب، بت پرست اور غیر موحدین ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے، جنھیں سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی گئی اور اسے قبول نہ کرنے پر ان سے جنگ کی گئی۔'' (شرح صحیح مسلم، نووی، ۱/۲۰۷)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

''حدیث میں 'الناس' (لوگ) کا لفظ آیا ہے۔ وہ اگر چہ عام ہے، لیکن اس سے خاص معنی مراد ہے، یعنی مشرکین، غیر اہل کتاب۔ اس کا ثبوت نسائی کی روایت سے ملتا ہے۔ اس میں 'الناس' کی جگہ 'المشرکین' کا لفظ ہے: اُمِرۡتُ اَنۡ اُقَاتِلَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مشرکین سے جنگ کروں) (فتح الباری: ۱/۷۷)

(۴) زیر بحث حدیث اسلام کی مجموعی تعلیمات (کہ دین کے معاملے میں کسی پر کوئی زور زبردستی نہیں، کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا) سے نہیں ٹکراتی ہے، بل کہ اس کا مخصوص پس منظر ہے، جس کی وضاحت سطورِ بالا میں کی گئی۔ اس کی تائید ایک دوسرے حدیث سے ہوتی ہے، جسے حضرت جابرؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیں۔ پھر جب وہ ایسا کرلیں تو ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں گے۔ الاّ یہ کہ وہ ان سے متعلق کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم کر دیے جائیں۔ رہا ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:
اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ۝ (الغاشیۃ: ۲۱، ۲۲)

(جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورۂ غاشیہ، ۳۳۴۱)

رسول اللہ ﷺ کا حکم الٰہی کی ترجمانی کرنے کے بعد مذکورہ ارشادِ الٰہی کی تلاوت کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ آپؐ کے نزدیک بھی ان دونوں کا محل الگ الگ تھا۔

(۵) حدیث کا آخری ٹکڑا وَ حِسَابُهُمۡ عَلَى اللّٰهِ (ان کا حساب اللہ کے ذمّے ہے) بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں سے مسلمانوں کی جنگ ہو رہی

ہے، اگر ان میں سے کوئی شخص اسلام لے آئے تو اس کا اعتبار کیا جائے گا اور اس چیز کی کھود کرید نہیں کی جائے گی کہ وہ سچے دل سے اسلام لایا ہے یا محض موت کے خوف سے اور جان بچانے کے لیے اس نے ایسا کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس حدیث میں دوسروں کو بہ جبر مسلمان بنانے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بل کہ یہ تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شخص کسی بھی حال میں اسلام کا اظہار کرے تو اس کا اعتبار کیا جائے اور خواہ مخواہ اس کے معاملے میں شک وشبہ سے کام نہ لیا جائے۔ تمام شارحین حدیث نے اس کا یہی مطلب بتایا ہے۔ چند اقوال ملاحظہ ہوں:

ابن حجرؒ: ''اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ ظاہری اعمال کو قبول کیا جائے گا اور ظاہر کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔'' (فتح الباری)

عینیؒ: ''یعنی ان کے اسرار کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو ہم ظاہر کے مطابق فیصلہ کریں گے اور ان سے صادر ہونے والے اقوال اور افعال کے ظاہر کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کریں گے۔'' (عمدۃ القاری، ۱/ ۲۰۷)

خطابیؒ: اس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کا اظہار کرے تو خواہ وہ اپنے دل میں کفر چھپائے ہوئے ہو، لیکن اس کے ظاہری اسلام کا اعتبار کیا جائے گا۔ (معالم السنن، طبع حلب، ۲/ ۱۱)

نوویؒ: ''اس میں کہا گیا ہے کہ احکام ظاہر کے مطابق جاری کیے جائیں گے۔ دلوں کے بھید جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے۔'' (شرح صحیح مسلم، ۱/ ۲۱۲)

طیبیؒ: یعنی جو شخص لا الہ الا اللہ کہہ دے اور اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرے اس سے ہم جنگ نہیں کریں گے اور اس کے اندروں میں نہیں جھانکیں گے، کہ وہ مخلص ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ یہ چیز اللہ کے حوالے ہے۔ اس کا حساب لینا اس کے ذمّے ہے۔''

(بہ حوالہ تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، عبدالرحمٰن مبارک پوری، طبع دیوبند، ۷/ ۲۸۳)

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں بھی اسلام قبول کرنے والوں کے بارے میں کسی شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا گیا، خواہ انھوں نے کیسے ہی حالات میں اس کا اظہار کیا ہو، بل کہ احادیث میں بعض واقعات ایسے بھی ملتے ہیں کہ دشمن کے کسی فوجی نے تلوار کی زد میں آنے پر کلمہ

پڑھ لیا، لیکن صحابی نے اسے قتل کر دیا، اللہ کے رسول ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے اس پر سخت ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ وہ مخلص ہے یا نہیں؟

(مسلم: ۲۷۷، ابوداؤد: ۲۶۴۳، ابن ماجہ: ۳۹۳۰)

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث اسلام کی مجموعی تعلیمات سے نہیں ٹکراتی، بل کہ اس کا ایک مخصوص پس منظر ہے۔ اس لیے اس کا عمومی مفہوم مراد لینا صحیح نہیں ہے۔

ضعیف اور موضوع احادیث

سوال: ہمارے روایتی مذہبی لٹریچر میں، بالخصوص وہ لٹریچر جو خانقاہی، صوفیانہ، بریلوی اور بعض دیگر حلقوں میں زیادہ پڑھا جاتا ہے، درج ذیل حدیثوں کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے:

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ۔ كُنْتُ نَبِيًّا وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ۔ اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ حدیثیں صحیح ہیں؟ سند، روایت، درایت، اور حدیثوں کی صحت و عدمِ صحت کے تعلق سے دیگر معیارات کے مدِ نظر ان کی صحت ثابت شدہ ہے یا نہیں؟ اگر یہ حدیثیں اپنے الفاظ اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے درست اور مبنی بر حقیقت ہیں تو ان کا صحیح مفہوم و مدلول اور مقصودِ بیان کیا ہے؟

بہ راہِ کرم جواب سے نوازیں۔

جواب: احادیث کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو قرآن فہمی پر بہت زور دیتے ہیں، لیکن احادیث کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کے نزدیک احادیثِ نبوی کی حیثیت محض تاریخی سرمایے کی ہے، جو تعبیر دین کے معاملے میں اپنی کچھ معتبریت نہیں رکھتا۔ اس لیے وہ خواہ کتنی ہی صحیح اور ثابت شدہ کیوں نہ ہوں، دین کے معاملے میں حجت نہیں ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو احادیث کو قرار واقعی ان کا صحیح مقام دیتے ہیں، انھیں حجت تسلیم کرتے ہیں اور معاملاتِ زندگی میں ان سے رہ نمائی حاصل کرنے کے قائل ہیں،

لیکن اس کے اخذ و استفادے کے سلسلے میں ان کا رویہ درست نہیں ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں بہت سے گم راہ فرقوں اور بد باطن افراد نے ہزاروں احادیث گھڑی ہیں اور بے بنیاد روایات اور بے سر و پا اقوال کو ارشاداتِ رسول کی حیثیت سے رواج دینے کی ناپاک کوششیں کی ہیں۔ اللہ جزائے خیر دے محدثین کرام اور ناقدینِ حدیث کو، کہ انھوں نے انتھک جدو جہد کر کے کھرے کھوٹے میں تمیز کی اور صحیح احادیث اور ضعیف و موضوع روایات کو چھانٹ کر الگ الگ کر دیا۔ اس لیے احادیث سے استفادہ اور استناد کے وقت غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی غیر ثابت شدہ قول کو ارشادِ نبوی کی حیثیت سے پیش کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كِذْبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (صحيح بخاری، کتاب العلم، ۱۰۸، مزید ملاحظہ کیجیے: صحیح مسلم، کتاب الزهد، ۷۵۱۰)

''جس شخص نے جان بوجھ کر میری جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

آپ نے جن روایات کا تذکرہ کیا ہے، مشہور محدثین اور معتبر ناقدینِ حدیث نے ان کو موضوع (من گھڑت) اور ضعیف قرار دیا ہے۔ ذیل میں اس سلسلے میں کسی قدر تفصیل درج کی جاتی ہے:

(۱) لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ

یعنی اے محمدؐ! اگر آپ نہ ہوتے تو یہ دنیا نہ پیدا کی جاتی۔ روایت میں ہے کہ یہ بات ایک موقع پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آں حضرت ﷺ سے فرمائی تھی۔ اس روایت کو دیلمی اور ابنِ عساکر نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، لیکن مشہور ناقدینِ حدیث نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

ملاحظہ کیجیے ابن الجوزی، الموضوعات، حسن صغانی، الاحاديث الموضوعة (ص ۷) جلال الدين سيوطی، اللآلی المصنوعة فی الاحاديث الموضوعة (۲۷۲/۱) ناصر الدين الالبانی، سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة (۲۹۹/۱-۳۰۰)

(۲) کُنْتُ نَبِیًّا وَّ آدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْن

یعنی میں نبی ہوں اس وقت سے جب کہ آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے، یعنی ان کی ابھی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ اسے مشہور فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب 'فصوص الحکم' میں نقل کیا ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہؒ نے ان پر سخت نقد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت بے بنیاد ہے، کسی محدث نے اس کی روایت نہیں کی ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۷ ۱۴، ۸، ۲۳) اس مضمون کی ایک روایت کچھ مختلف الفاظ میں ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اور طبرانی نے المعجم الکبیر میں روایت کی ہے: کُنْتُ نَبِیًّا وَ آدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ۔ اس کی سند بھی مضبوط نہیں ہے۔ اس میں ایک راوی قیس بن الربیع ہے، جس سے بعض منکر روایات مروی ہیں۔ امام ترمذی نے اسے کتاب العلل میں ذکر کیا ہے اور اسے 'غریب' قرار دیا ہے، جو ضعیف کی ایک قسم ہے۔

(عبدالرؤف مناوی، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دار احیاء السنۃ النبویۃ، ۵/ ۵۴)

(۳) اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ

یعنی سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا۔ پوری روایت یوں ہے کہ ''ایک مرتبہ حضرت جابرؓ نے آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا: اللہ نے اشیائے کائنات میں سب سے پہلے کس کو پیدا کیا؟ آپؐ نے جواب دیا: اے جابر! اللہ نے سب سے پہلے تمھارے نبی کے نور کو پیدا کیا۔'' اسے بھی محدثین نے موضوع قرار دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے عبدالحی فرنگی محلی، الآثار المرفوعة فی الأخبار الموضوعة، ص ۲۷۲، اسماعیل عجلونی، کشف الخفاء و مزیل الالباس (۱/ ۲۶۵)، ناصر الدین الالبانی، سلسلة الاحادیث الصحیحة (۱/ ۸۲۰) میں ضمنی حوالہ۔

(۴) اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا

یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ۔ اس روایت کو احمد، حاکم، طبرانی، ابن عدی اور ابونعیم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اس کے بارے میں محدثین مختلف الرائے ہیں۔ حافظ علائی، زرکشی اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ بہت سی سندوں سے مروی ہے۔ اگرچہ یہ

سندیں قوی نہیں ہیں، لیکن کثرتِ طرق سے 'حسن' کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن علامہ ابن الجوزی، ذہبی، ابوزرعہ، یحیٰ بن معین، دارقطنی نے اسے موضوع اور بے اصل قرار دیا ہے۔ امام بخاری اور امام ترمذی اسے منکر کہتے ہیں۔ (عبدالرؤف مناوی، فیض القدیر، ۳/ ۴۷)

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب منہاج السنة النبویة میں اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اسے شیعوں کی من گھڑت قرار دیا ہے۔ ناصر الدین البانیؒ بھی اسے غیر صحیح اور قابلِ رد کہتے ہیں۔ (سلسلة الاحادیث الصحیحة ۱/ ۲۲، مقدمه)

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی نے اپنی کتاب میں ان روایات کا تذکرہ موضوع روایات کی حیثیت سے کیا ہے۔ (فتنۂ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱، ۱۲۳، ۳۲)

احادیثِ نبوی سے استفادے کے معاملے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور احتیاط پر مبنی رویہ یہ ہے کہ فضائل ومناقب کے معاملے میں بھی صرف صحیح اور ثابت شدہ احادیث سے استفادہ کیا جائے اور ضعیف اور موضوع روایات سے بالکلیہ اجتناب کیا جائے۔

حدیث نبوی کی صحت وعدمِ صحت کی پہچان

سوال: 'کیا غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین جائز ہے؟' کے عنوان سے آں جناب نے ایک سوال کا جو جواب دیا ہے اس میں سودی لین دین کی شناعت بیان کرتے ہوئے ایک حدیث نقل کی ہے، جس کا مضمون یہ ہے: ''سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں۔ اس کا سب سے کم تر درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔'' یہ حدیث مجھے 'موضوع' یعنی من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ آپ ایسے ناشائستہ انداز سے کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ سود کی حرمت ثابت کرنے والی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ اس لیے ایسی غیر معتبر اور ثقاہت سے گری ہوئی احادیث سے اجتناب اولیٰ ہے۔

جواب: کسی حدیث کی صحت یا عدمِ صحت جانچنے کے لیے محدثین کرام نے مختلف اصول وضع

کیے ہیں۔ ان کا تعلق روایت سے بھی ہے اور درایت سے بھی۔ مثلاً سندِ حدیث میں کسی راوی کا نام چھوٹ گیا ہو یا کسی راوی کا حافظہ کم زور ہو یا اس نے ضبطِ الفاظ میں تساہل سے کام لیا ہو یا اس کا اخلاق و کردار مشتبہ ہو یا وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں جھوٹ بولتا ہو تو اس کی روایت کو ضعیف کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح روایتوں کی داخلی شہادتوں سے بھی انھیں پرکھا گیا ہے۔ مثلاً کسی روایت میں لفظی یا معنوی رکاکت پائی جائے، وہ حکمت و اخلاق کی عام قدروں کے منافی ہو، حس و مشاہدہ اور عقل عام کے خلاف ہو، اس میں حماقت یا مسخرہ پن کی کوئی بات کہی گئی ہو، اس کا مضمون عریانیت یا بے شرمی کی کسی بات پر مشتمل ہو وغیرہ تو اس کا ضعیف و موضوع ہونا یقینی ہے۔

حرمت سود کی شناعت بیان کرنے والی جو حدیث اوپر سوال میں نقل کی گئی ہے، اس کا موضوع ہونا کس اعتبار سے ہے؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اندازِ سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر نقد درایت کے پہلو سے ہے۔ لیکن اس بنیاد پر اسے موضوع قرار دینا درست نہیں۔ ماں کی عزت و احترام انسانی فطرت میں داخل ہے۔ تمام مذاہب میں اس پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ تقدس کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ زنا و بدکاری تو دور کی بات ہے، کوئی سلیم الفطرت انسان اپنی ماں کی طرف بری نظر سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ سود کے انسانی سماج پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا شکار ہونے والوں کی زندگیاں برباد ہوتی ہیں اور سودی کاروبار کرنے والوں کے اخلاق و کردار پر خراب اثر پڑتا ہے۔ اس کی خباثت و شناعت واضح کرنے کے لیے اسے 'ماں کے ساتھ زنا' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں عریانیت یا ناشایستگی کی کوئی ایسی بات نہیں، جس کی بنا پر اس کو موضوع قرار دیا جائے۔

ایک زمانے میں منکرین حدیث نے یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ جو حدیث بھی کسی وجہ سے انھیں اچھی نہ لگے، اسے بلا تکلف موضوع قرار دے دیتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی مایہ ناز تصنیف 'سنت کی آئینی حیثیت' میں ان کا زبردست تعاقب کیا ہے اور ان کے نام نہاد دعووں کا ابطال کیا ہے۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں ایسے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، جن کی ایک مثال اوپر درج سوال میں پیش کی گئی ہے، انھیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

ایک فرقہ کو جنتی اور دیگر فرقوں کو جہنمی بتانے والی حدیث صحیح ہے

سوال: ایک حدیث میرے مطالعہ میں آئی جس میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا، بقیہ لوگ جہنمی ہوں گے۔'' یہ حدیث پڑھ کر میں بہت تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ کیا امت کی اکثریت جہنم میں جائے گی اور صرف چند لوگ جنت کے مستحق ہوں گے۔ یہاں ایک مولانا صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ حدیث کا اتنا حصہ تو صحیح ہے جس میں امت کے تہتر فرقوں میں بٹنے کی بات کہی گئی ہے۔ لیکن اس کا اگلا حصہ جس میں صرف ایک فرقے کے جنتی اور دیگر فرقوں کے جہنمی ہونے کی بات کہی گئی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ جن روایتوں میں یہ الفاظ ہیں ان کی سندیں ضعیف ہیں۔

بہ راہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں۔ کیا مولانا صاحب کی بات صحیح ہے؟

جواب: اس مضمون کی حدیث متعدد صحابۂ کرامؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِفۡتَرَقَتِ الیَهُوۡدُ عَلٰی اِحۡدٰی اَوۡ اِثۡنَتَیۡنِ وَ سَبۡعِیۡنَ فِرۡقَةً، وَ تَفَرَّقَتِ النَّصَارٰیٰ عَلٰی اِحۡدٰی وَاثۡنَتَیۡنِ وَ سَبۡعِیۡنَ فِرۡقَةً، وَ تَفَرَّقُ اُمَّتِی عَلٰی ثَلاَثٍ وَّ سَبۡعِیۡنَ فِرۡقَةً۔

''یہود اکہتر، بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ اسی طرح نصاریٰ بھی اکہتر بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔''

یہ حدیث **سنن ابی داؤد** (کتاب السنة، باب شرح السنة، ۴۵۹۶)، **جامع ترمذی** (ابواب الایمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الامة، ۲۶۴۰)، **سنن ابنِ ماجہ** (کتاب الفتن، باب افتراق الامم، ۳۹۹۱) اور **مسند احمد** (۲/۳۳۲) میں مروی ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ نیز فرمایا ہے کہ اس مضمون کی حدیث حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت عوف بن مالکؓ سے بھی مروی ہے۔ (و فی الباب عن سعد و عبد الله بن عمرو و عوف بن مالک)

بعض دیگر صحابۂ کرامؓ سے مروی احادیث میں کچھ اضافہ ہے۔ ذیل میں اس کی تفصیل دی جارہی ہے:

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آگے یہ بھی فرمایا:

ثِنَتَانِ وَ سَبْعُوْنَ فِی النَّارِ وَ وَاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ وَ هِیَ الجَمَاعَۃِ۔

''بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔ اور وہ الجماعۃ میں ہوگا۔''

یہ حدیث سنن ابی داؤد (كتاب السنة، باب شرح السنة، ۴۵۹۷) اور سنن الدارمی (كتاب السير، باب فی افتراق هذه الامة، ۲۵۱۸) میں آئی ہے۔ عصر حاضر کے مشہور محدث علامہ محمد ناصر الدین البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (صحیح الجامع، ۲/ ۳۷۵)

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی حدیث میں اضافے کے الفاظ یہ ہیں:

کُلُّهَا فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَۃٌ وَ هِیَ الجَمَاعَۃِ۔

''تمام فرقے جہنمی ہیں، سوائے ایک کے اور وہ الجماعۃ ہے۔''

یہ حدیث سنن ابن ماجہ (كتاب الفتن، باب افتراق الامم، ۳۹۹۳) اور مسند احمد (۳/ ۱۲۰) میں آئی ہے۔ محدث بوصیریؒ کہتے ہیں: هذا اسناد صحيح رجاله ثقات (اس کی سند صحیح ہے، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)۔ علامہ البانی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عوف بن مالکؓ سے مروی حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

وَاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ وَ ثِنَتَانِ وَ سَبْعُوْنَ فِی النَّارِ، قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ هُمْ؟ قَالَ الْجَمَاعَۃُ۔

''ایک گروہ جنت میں جائے گا اور بہتر گروہ جہنم میں جائیں گے۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا: وہ کون لوگ ہوں گے (جو جنت میں جائیں گے) آپؐ فرمایا: الجماعۃ۔''

یہ حدیث بھی سنن ابن ماجہ (كتاب الفتن، باب افتراق الامم، ۳۹۹۲) میں آئی

ہے۔اس کی سند میں ایک راوی (راشد بن سعد) پر کچھ کلام کیا گیا ہے، لیکن ابو حاتم نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ سچے ہیں۔ ایک دوسرے راوی عباد بن یوسف ہیں۔ ان سے صرف ابنِ ماجہ نے تخریج کی ہے اور وہ بھی صرف یہی حدیث۔ ابن عدی کہتے ہیں: بہت سی روایات میں یہ منفرد ہیں۔ لیکن ابنِ حبان نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب الثقات میں کیا ہے۔ اس سند کے دیگر تمام راوی ثقہ ہیں۔ علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی حدیثِ نبوی میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ، قَالُوا: وَ مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِي۔

''سب جہنم میں جائیں گے، سوائے ایک گروہ کے، صحابہؓ نے عرض کیا: وہ کون گروہ ہوگا، اے اللہ کے رسولؐ! فرمایا: جو اس راہ پر چلے گا جس پر میں اور میرے اصحاب چل رہے ہیں۔''

اس کی روایت امام ترمذی (ابواب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ، ۲۶۴۱) نے کی ہے۔ اور کہا ہے: ھذا حدیث حسن غریب مفسر لا نعرفہ مثل ھذا الا من ھذا الوجہ۔ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم الافریقی ضعیف ہے، لیکن دیگر شاہد روایتوں کی وجہ سے مشہور محدثین علامہ البانی اور علامہ عبدالقادر الارناؤط نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے الجماعۃ کی تشریح ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ جن روایتوں میں اضافہ ہے وہ بھی صحیح ہیں۔ انھیں ضعیف کہہ کر اضافے کو رد کرنا مناسب نہیں ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے تہتر فرقوں میں سے صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا، بقیہ بہتر فرقے ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں گے، وہ کبھی جنت میں نہ جا سکیں گے۔ کسی کے جنتی ہونے کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے جہنم کے عذاب سے بچا لیا جائے گا اور ابتدا ہی میں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ جہنم میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا۔ اسی طرح کسی کے جہنمی ہونے کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ

اسے ابتدا ہی میں جہنم میں داخل کیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور دوسرا یہ کہ اپنے گناہوں کی سزا پانے کے لیے وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا، بعد میں اس سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اس حدیث میں جس گروہ کے جنتی ہونے کا ذکر ہے وہ پہلے مفہوم میں ہے اور دیگر جن گروہوں کے جہنم میں جانے کا ذکر ہے وہ دوسرے مفہوم میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا پانے کے لیے جہنم میں داخل کیے جائیں گے، اس کے بعد انھیں بھی جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔ حدیث میں تمام گروہوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے امتی (میری امت) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ خطابی شارح سنن ابی داؤد فرماتے ہیں:

فِيْهِ دَلَالَةٌ عَلٰى أَنَّ هٰذِهِ الْفِرَقَ كُلَّهَا غَيْرُ خَارِجَةٍ عَنِ الدِّيْنِ إِذْ قَدْ جَعَلَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ كُلَّهُمْ مِّنْ أُمَّتِهٖ۔ (معالم السنن، المطبعة العلمية حلب، شام، ۱۹۳۳، ۴/ ۲۹۵)

''اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ تمام فرقے دین سے خارج نہیں ہیں، اس لیے کہ نبی ﷺ نے سب کو اپنی امت میں شامل کیا ہے۔''

مولانا سید احمد عروج قادری نے اس حدیث کے سلسلے میں بعض اشکالات کا ازالہ کرتے ہوئے اس کی اچھی تشریح کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے احکام ومسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جلد اول، ص: ۱۳۷-۱۴۱

گم راہ فرقے اور سزائے جہنم

سوال: ایک سوال کے جواب میں آپ نے 'ایک فرقے کو جنتی اور دیگر فرقوں کو جہنمی بتانے والی حدیث صحیح ہے' کے زیرِ عنوان جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ الجھن پیدا کر رہا ہے۔ آپ نے جو احادیث تحریر فرمائی ہیں ان میں صاف صاف لکھا ہے کہ ایک فرقہ ہی جنت میں جائے گا، باقی تمام فرقے جہنم میں جائیں گے، لیکن آگے آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''یہ تمام فرقے دین سے خارج نہیں ہیں۔'' پوچھا گیا سوال صاف نہیں ہوا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جن روایتوں میں یہ زائد جملہ

ہے ''صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا، دیگر تمام فرقے جہنمی ہوں گے'' وہ ضعیف ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا ہے۔

یہ بہتر تہتر فرقوں کا چرچا کچھ جماعتوں اور مسلکوں میں عام ہو رہا ہے۔ ہر کوئی اپنی روٹی پر دال کھینچ رہا ہے۔ اس لیے التماس ہے کہ اس حدیث کے سلسلے میں ہونے والے اشکالات دور فرمائیں۔

جواب: قرآن و حدیث میں بہت سے مقامات پر مسلمانوں کو ہوشیار کیا گیا ہے کہ وہ گزشتہ امتوں کے نقشِ قدم پر نہ چلیں، جن گم راہیوں کا وہ شکار ہوئے ان سے بچیں، جس طرح انھوں نے کفر کی روش اختیار کی، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ موڑا اور ان کے احکام کی سنی ان سنی کی، اس طرح کا ناپسندیدہ رویہ اختیار نہ کریں۔ (آل عمران: ۱۵۶، الانفال: ۲۱، ۴۷، النحل: ۹۲، الاحزاب: ۶۹، الحشر: ۱۹) خاص طور پر انھیں گزشتہ امتوں کی طرح اختلاف و تفرقے میں پڑنے سے روکا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلاَ تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط (آل عمران: ۱۰۵)

''کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔''

بہت سی احادیث میں بھی اختلاف و انتشار کی مذمت کی گئی ہے اور اتحاد و اتفاق پر زور دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ایسی بھی احادیث ہیں جن میں خبر دی گئی ہے کہ امت اسی طرح اختلافات کا شکار ہوگی جس طرح گزشتہ امتیں ہوئیں اور اسی طرح غلط راہوں پر چلے گی جس طرح گزشتہ امتیں چلی تھیں۔ ان میں سے ایک زیرِ بحث حدیث بھی ہے۔

اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ ''امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے، ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔'' ترمذی کی ایک روایت (۲۶۴۱) میں ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ وہ جنتی فرقہ کون ہوگا؟ تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''ما انا علیه و اصحابی'' یعنی جو اس روش پر قائم ہوگا جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔ اس حدیث کا

مطلب (جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا) یہ نہیں ہے کہ بہتر فرقے ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں گے، وہ کبھی جنت میں نہ جا سکیں گے۔ مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں حدیثِ مذکور کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان دین میں بدعتیں رائج نہ کریں، اپنی خواہشاتِ نفس پر نہ چلیں، بل کہ کتاب وسنت کو رہنما بنائیں، اسے مضبوطی سے تھامیں اور اس روش پر قائم رہیں جس پر حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ قائم تھے۔ جو شخص یا جو گروہ بھی اس راستے سے ہٹ جائے گا وہ گم راہ ہو جائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ گم راہی کے مدارج ہوتے ہیں۔ ایک گم راہی ایسی ہو سکتی ہے جو کسی شخص یا گروہ کو دائرۂ اسلام ہی سے خارج کر دے اور بعض اس سے کم درجے کی ہو سکتی ہے۔ ناجی اور جنتی ہونے کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ انسان دوزخ کے عذاب سے بچا لیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ دوزخ میں سزا بھگت کر جنت میں داخل کیا جائے۔ اس حدیث میں جس گروہ کے جنتی ہونے کا ذکر ہے وہ پہلے مفہوم میں ہے۔ جن بہتر فرقوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ دوزخ میں ہوں گے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سب کے سب کافروں کی طرح مخلّد فی النار ہوں گے۔ یہ حدیث اس مسئلے سے بحث نہیں کرتی کہ کون مخلّد فی النار ہوگا اور کون نہیں؟ اس کا فیصلہ دوسرے دلائل سے کیا جائے گا۔''

(احکام ومسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ۱/۱۴۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''کسی اہل قبلہ گروہ کو کافر قرار دینے یا نہ دینے سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے، بل کہ اس میں مسلمانوں کو اختلافِ عقائد واعمال سے بچنے اور کتاب وسنت کی پیروی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔'' (حوالہ سابق، ص: ۱۳۸)

یہ صحیح ہے کہ جن روایتوں میں یہ زائد جملہ آیا ہے انھیں بعض علما نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان میں ابنِ حزم (م ۴۵۶ھ) ابن الوزیر (م ۸۴۰ھ) شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) اور نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ وہیں دیگر بہت سے محقق اور معتبر علما نے انھیں صحیح قرار دیا ہے۔ ان میں حاکم (م ۴۰۵ھ)، ذہبی (م ۷۴۸ھ) ابن تیمیہ

(م ۷۲۸ھ)، شاطبی (م ۷۹۰ھ) اور عراقی (م ۸۰۷ھ) اہم ہیں۔ محدثِ عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی (م ۱۴۲۰ھ) نے اپنی کتاب سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ میں اس حدیث کے تمام طرق کو جمع کر دیا ہے، اس کی سندوں پر مفصل بحث کی ہے اور انھیں صحیح قرار دیا ہے۔

(ملاحظہ کیجیے المجلد الاول، القسم الاول، ص ۴۰۴-۴۱۴، حدیث نمبر: ۲۰۴)

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جن روایتوں میں یہ زائد جملہ ہے ان کے ضعف کی وجہ سے ہی امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے انھیں اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا ہے۔ اولاً اس مضمون کی جن روایتوں میں یہ زائد جملہ نہیں ہے وہ بھی صحیحین میں مذکور نہیں ہیں۔ ثانیاً کسی حدیث کا بخاری و مسلم میں مروی نہ ہونا اس کے ضعف کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے اپنی کتابوں میں صحیح احادیث اپنی مخصوص شرائط کے مطابق جمع کی ہیں۔ ورنہ ان کی کتابوں کے علاوہ بھی بے شمار صحیح احادیث ہیں۔ بہت سی صحیح احادیث ایسی بھی ہیں جو ان کی شرائط پر ہیں پھر بھی ان کی کتابوں میں جگہ نہیں پا سکی ہیں۔ علما نے 'مستدرک علی الصحیحین' کے نام سے ان کے مجموعے تیار کیے ہیں۔

عذابِ جہنم سے متعلق اہل السنۃ والجماعۃ کا کیا عقیدہ ہے؟ اس کی وضاحت علامہ سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''اس عقیدے کے مطابق گنہ گاروں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو کہ گنہ گار تھے، مگر دل میں ایمان رکھتے تھے۔ ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے۔ ایسے لوگوں کی بخشایش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے۔'' (سیرت النبی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ۴/ ۵۸۸)

احادیث میں بعض ایسے اعمال کا تذکرہ ہے جن کا ارتکاب کرنے والوں کو جہنم کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مثلاً تکبر کرنا، دوسروں کا مال ناحق ہڑپ کر لینا، سود کھانا، جان داروں کی تصویر بنانا، جانور کو تکلیف دینا، ریا کاری کرنا، سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا، سایہ دار درخت کاٹنا وغیرہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان اعمال بد کا ارتکاب کرنے والے ہمیشہ کے

لیے جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، بل کہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ صاحب ایمان ہیں تو جہنم میں ان اعمال بد کی سزا پانے کے بعد اس سے نکال لیے جائیں گے اور ایمان کی یہ دولت انھیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے لکھا ہے:

''احادیث کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مختلف قسم کی نیکیوں کی نسبت جنت کی طرف اور مختلف قسم کی برائیوں کی نسبت دوزخ کی طرف کی گئی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جنت نیکیوں کا گھر ہے اور دوزخ برائیوں کا گھر ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو نیکیوں کی طرف لپکنا چاہیے اور برائیوں سے بھاگنا چاہیے۔ ترغیب و ترہیب کے اس انداز سے ذخیرۂ احادیث بھرا ہوا ہے۔ جس عملِ خیر پر جنت کی بشارت اور جس عملِ شر پر دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تنہا وہ عملِ خیر کسی کو جنت کا اولین مستحق اور تنہا وہ عملِ شر کسی کو دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔''

(احکام و مسائل، ۱/ ۱۳۸-۱۳۹)

اللہ کے رسول ﷺ نے ہدایت کی جو راہ واضح کی ہے اور جس پر آپؐ کے اصحاب نے چل کر دکھایا ہے، اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اس کا انکار کرتا ہے، اور اس سے مختلف راہ اختیار کرتا ہے، تو اس کی گم راہی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ایسے شخص کا انجام آخرت میں بڑا دردناک ہوگا۔ اسے ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص اساسیاتِ اسلام پر ایمان رکھتا ہے، لیکن بعض اعمالِ بد میں مبتلا ہے تو آخرت میں یا تو اللہ تعالیٰ اپنی شانِ کریمی سے اسے معاف کرکے ابتدا ہی میں اسے جنت میں داخل کردے گا، یا اپنے گناہوں کی سزا پاکر وہ اس کا مستحق بنے گا۔ مولانا عروج قادری فرماتے ہیں:

''اس حقیقت کو سامنے رکھ کر بہتر فرقوں والی حدیث کا بھی صحیح مطلب سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان کہلانے والا فرقہ جان بوجھ کر اس عقیدہ و عمل کو ترک کردے جس پر نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ تھے تو پھر وہ مسلمان کس بنیاد پر باقی رہے گا؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دوسرے دلائل سے یہ فیصلہ ہوگا کہ اس کی گم راہی کس درجے کی ہے؟ (حوالہ سابق، ص: ۱۳۹)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اس حدیث کو بنیاد بنا کر امت کے مختلف فرقوں کے خلاف

وکفر وفسق کے فتوے صادر کرنا صحیح نہیں اور نہ عقلی اشکالات پیدا کرکے اس حدیث کو ضعیف یا موضوع قرار دینا درست ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی طبعی نظافت

سوال: آپ نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان 'رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں' (شائع شدہ ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی نومبر ۲۰۰۹ء) میں رسول اکرم ﷺ کی خانگی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ اپنے کپڑوں سے جوئیں خود نکال لیا کرتے تھے۔'' یہ کام آپؐ کی طبعی نظافت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آپؐ تو صفائی ستھرائی کا نمونہ تھے۔ اس لیے حدیث سمجھنے میں زحمت محسوس ہو رہی ہے۔ بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب: اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ اول یہ کہ معتبر اور ثابت شدہ روایات کے بارے میں تاویل وتوجیہ کا ذہن بنانا چاہیے، اس کے بہ جائے اوّل وہلہ میں اس پر اشکال وارد نہیں کر دینا چاہیے۔ دوم یہ کہ کسی واقعے پر غور وخوض اپنے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر نہیں، بل کہ اس کے زمانۂ وقوع کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ سرزمین عرب کا موسم بہت گرم ہوتا ہے۔ عہد نبوی میں مدینہ میں صرف چند کنویں تھے، جن سے پوری آبادی پانی حاصل کرتی تھی۔ گھر میں پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے صرف دو ایک مٹکے ہوتے تھے۔ اس لیے آج کل کی طرح ممکن نہ تھا کہ روزانہ صبح وشام غسل کیا جائے، پہننے کے کپڑے بھی بہت زیادہ نہیں ہوتے تھے کہ روزانہ انھیں تبدیل کیا جائے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت میں زور اس بات پر ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ گھر کے چھوٹے چھوٹے کام بھی اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے، دوسروں پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ بہ طور مثال انھوں نے دو کام بیان کر دیے کہ آپؐ اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے تھے اور اپنے کپڑوں سے جوں خود ہی نکال لیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب نہ یہ ہے کہ آپ گھر میں صرف یہی دو کام انجام دیتے تھے، بقیہ دیگر خانگی کام دوسرے لوگوں کے حوالے تھے اور نہ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آپ ہر وقت یہی دونوں کام یا ان میں سے کوئی ایک کام کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کبھی غسل کرنے کے بعد آپؐ کے پاس دوسرے دھلے ہوئے کپڑے نہیں ہوئے تو آپؐ نے وہی کپڑے پہن لیے اور انھیں پہننے سے پہلے پلٹ کر دیکھ لیا کہ کہیں کوئی جوں تو نہیں ہے۔ آپؐ کی طبعی نظافت اور صفائی ستھرائی کے معمول کو (جس کا تذکرہ احادیث میں کثرت سے ملتا ہے) دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ یہ صورت حال شاذ و نادر ہی پیش آتی ہوگی۔

حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ایک قابل تقلید نمونہ پیش کرتی ہے۔ دین دار گھرانوں میں بھی اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بیویاں گھروں میں خادماؤں کی طرح اپنے شوہروں کے چھوٹے بڑے تمام کام انجام دیتی ہیں اور اگر کبھی ان سے کچھ کوتاہی ہو جائے تو شوہران نام دار کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اختیار کرتے ہوئے انھیں گھریلو کاموں میں اپنی بیویوں کا ہاتھ بٹانا چاہیے اور اپنے نجی کام خود کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

بعض احادیث پر اشکالات

سوال: دو احادیث پر کچھ اشکالات پیدا ہو رہے ہیں، بہ راہِ کرم تشفی بخش جواب سے نوازیں:

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے سجدے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' (ابوداؤد)

اس حدیث پر درج ذیل اشکالات پیدا ہو رہے ہیں:

الف: یہ حدیث اسلام کے تصورِ توحید کے منافی ہے۔

ب: ہندوؤں کے یہاں عورت کے بارے میں تصور ہے کہ وہ شوہر کی داسی ہے۔ پتی ورتا ہونا اس کا دھرم ہے اور پتی ورتا کے معنیٰ یہ ہیں کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔ اس حدیث سے بھی یہی تصور ابھرتا ہے۔

ج: یہ حدیث قرآن کی اس تعلیم کے خلاف ہے: ''اللہ نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔'' (النساء:۱)

د: اس حدیث سے عورت کی تذلیل وتوہین معلوم ہوتی ہے۔

(۲) ایک حدیث ہے کہ حضرت سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں: ''میں کچھ لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا: 'اے اللہ کے رسولؐ! میں اپنے آپ کو آپ کے لیے ہبہ کرتی ہوں۔' آپؐ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک شخص نے اٹھ کر عرض کیا: 'اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ اس سے میرا نکاح کرادیجیے۔' آپؐ نے فرمایا: 'کیا تمھارے پاس کوئی چیز ہے؟ (یعنی اسے مہر میں کیا دوگے؟)' اس نے کہا: 'کچھ بھی نہیں۔' آپؐ نے فرمایا: 'جا کر تلاش کرو، کچھ نہیں تو لوہے کی انگوٹھی سہی۔' اس نے جا کر ڈھونڈا اور کچھ دیر کے بعد واپس آکر کہا۔ 'حضورؐ! مجھے کوئی چیز نہیں ملی، یہاں تک کہ لوہے کی انگوٹھی بھی مہیا نہیں کرسکا ہوں، البتہ میرا یہ تہبند حاضر ہے۔ اس عورت کو میں آدھا تہبند دے دوں گا۔' آپؐ نے فرمایا: 'تیرا یہ تہبند کس کام کا؟، اگر اسے تو پہنے گا تو تیری بیوی برہنہ ہوجائے گی اور اگر اسے اس نے پہنا تو پھر تم کیا پہنوگے؟'' پھر آپؐ نے اس سے فرمایا: 'تمھیں قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے؟' وہ بولا: 'ہاں! فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔' آپؐ نے فرمایا: 'جاؤ، میں نے قرآن کی ان سورتوں کے بدلے اس عورت سے تمھارا نکاح کردیا۔' (بخاری ومسلم)

اس حدیث پر کئی اشکالات وارد ہوتے ہیں:

۱- عورت نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کیا تھا۔ آپؐ کی خاموشی کے بعد حاضرین میں سے کسی شخص کا خواہش نکاح ناقابل فہم ہے۔

۲- عورت کی رائے معلوم کیے بغیر رسول اللہ ﷺ کا اس سلسلے کو آگے بڑھانا کیسے ممکن ہے؟

۳- مہر جو مرد پر فرض ہے اور عورت کا حق ہے، اس کو لوہے کی انگوٹھی جیسی حقیر چیز پر محمول کرنے کی کیا شریعت اجازت دیتی ہے؟

۴- اس شخص کا مہر میں تہبند پیش کرنا، اس سے زیادہ بیہودہ مذاق اور کیا ہوسکتا ہے؟

۵- اگر موصوف اس قدر مفلس تھے تو وہ اپنی بیوی کا نفقہ کس طرح ادا کرسکتے تھے؟ ایسے

شخص کے لیے تو اللہ کے رسول ﷺ کی یہ تعلیم ہے کہ: ''جو شخص نکاح کی ذمے داریاں ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزہ رکھے، کیوں کہ یہ اس کے شہوانی جذبات کو کم کردے گا۔'' (بخاری و مسلم)

۶- کیا ان حالات میں مہر مؤجّل پر عمل نہیں کیا جا سکتا تھا؟

جواب: احادیث کا مطالعہ کرتے وقت درج ذیل باتوں کو ضرور اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے:

۱- کوئی حدیث اگر متعدد کتبِ حدیث میں مروی ہو اور صحیح سندوں سے ثابت ہو تو اس کے بارے میں توجیہ و تاویل کا ذہن بنانا چاہیے، نہ کہ اس پر اشکالات وارد کرنے کا۔ محدثین نے احادیث کی چھان پھٹک میں غیر معمولی محنت کی ہے۔ انھوں نے روایت اور درایت دونوں پہلوؤں سے احادیث کو پرکھا ہے اور متعین اصول وضوابط کی روشنی میں صحیح، ضعیف اور موضوع روایات کو الگ الگ کر دیا ہے۔

۲- دین کی کسی تعلیم کے فہم کے لیے محض ایک حدیث پر انحصار کافی نہیں ہے۔ بل کہ اس موضوع کی دوسری احادیث کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سب کو سامنے رکھ کر ہی صحیح نتیجہ مستنبط کیا جا سکتا ہے۔

۳- کسی حدیث میں کوئی واقعہ مذکور ہو تو اس میں واقعے کی تمام جزئیات کی صراحت نہیں ہوتی۔ کچھ باتیں بین السطور، سیاق اور حالات سے مستنبط کرنی ہوتی ہیں۔ محدثین بھی بسا اوقات ایک حدیث کا صرف متعلقہ حصہ ایک جگہ روایت کرتے ہیں، اس کے دوسرے حصے دوسرے مقامات پر نقل کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی حدیث میں واقعے کا کوئی جزئیہ مذکور نہ ہو تو اس کا بالکلیہ انکار صحیح نہ ہوگا، جب تک کہ اس حدیث کے تمام اجزاء اکٹھا کر کے بالاستیعاب ان کا مطالعہ نہ کر لیا جائے۔

درج بالا سوال کی پہلی حدیث متعدد صحابۂ کرام سے حدیث کی مختلف کتابوں میں مروی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ (ترمذی)، حضرت قیس بن سعدؓ (ابو داؤد)، حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰؓ (ابن ماجہ)، حضرت طلق بن علیؓ (ترمذی و نسائی)، حضرت ام سلمہؓ (ترمذی و ابن ماجہ)،

حضرت عائشہؓ (ابن ماجہ واحمد)، حضرت معاذ بن جبلؓ (احمد و بزار)، حضرت سراقہ بن مالکؓ (طبرانی)، حضرت بریدہؓ (حاکم) اور حضرت ابن عباسؓ (بزار) وغیرہ۔ ان میں سے کچھ صحیح سندوں سے مروی ہیں، کچھ حسن اور کچھ ضعیف ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں علامہ شوکانی نے لکھا ہے: هٰذِهٖ أَحَادِيْثُ يَشْهَدُ بَعْضُهَا لِبَعْضٍ وَّ يُقَوِّى بَعْضُهَا بَعْضًا۔ نیل الاوطار، طبع مصر، ۶/۳۶۱-۳۶۲) (شواہد کی بنا پر یہ احادیث قوی ہو جاتی ہیں)

یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ حدیث اسلام کے تصورِ توحید کے منافی ہے۔ یہ اسلام کے تصوّرِ توحید کے منافی اس وقت ہوتی، جب عورت کو حکم دیا جاتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ علامہ مناویؒ لکھتے ہیں: فِيْهِ تَعْلِيْقُ الشَّرْطِ بِالْمُحَالِ وَ أَخْبَرَ الْمُصْطَفٰى ﷺ اَنَّ ذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ۔ فیض القدیر، ۵/۳۲۹ (اس میں شرط کو محال پر معلق کیا گیا ہے اور آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا حکم نہیں دیا گیا ہے) احادیث میں یہ اسلوب عام ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کے مناقب میں ایک حدیث مروی ہے: لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ۔ ترمذی: ۳۶۸۶ (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے) اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کی نبوت کی پیشین گوئی کی تھی۔ مسلیمہ کذاب کے نمائندوں سے آپؐ نے فرمایا: لَوْلَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اَعْنَاقَكُمَا۔ ابو داؤد: ۲۷۶۱ (اگر سفیروں کو قتل نہ کیے جانے کا ضابطہ نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ سفیروں کو قتل کرنا جائز ہے۔ ایک مشکوک کردار والی عورت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا: لَوْ رَجَمْتُ اَحَدًا بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ لَرَجَمْتُ هٰذِهٖ۔ بخاری: ۵۳۱۶ (اگر بغیر کسی ثبوت کے میں کسی کو سنگسار کرتا تو اسے کر دیتا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ بغیر کسی ثبوت کے حد جاری کر دینا جائز ہے۔ اسی طرح زیر بحث حدیث کا بھی مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس حدیث سے ہندوؤں کے عقیدے کی طرح شوہر کو دیوتا اور بھگوان سمجھنے کا تصور ابھرتا ہے۔ اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے بعض ان روایتوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے، جن میں حدیث کا پس منظر بھی مذکور ہے۔ ابو داؤد (۲۱۴۰) کی روایت میں حضرت قیس بن سعدؓ فرماتے ہیں: میں حیرہ گیا تو وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا کو سجدے

کرتے ہیں۔ میرے جی میں آیا کہ اس سجدۂ تعظیمی کے تو رسول اللہ ﷺ زیادہ مستحق ہیں۔ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ اور اپنے خیال کا اظہار کیا۔ تب آپؐ نے یہ بات فرمائی۔ ابن ماجہ (۱۸۵۳) میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنے سفرِ شام میں عیسائیوں کو اپنے پادریوں کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ واپس آکر انھوں نے بھی حضرت قیسؓ کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کیا تب آپؐ نے یہ بات فرمائی۔ حدیث سے کیا مستنبط ہوتا ہے؟ علامہ مناویؒ کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں: مَقْصُوْدُ الْحَدِیْثِ الْحَثُّ عَلٰی عَدَمِ عِصْیَانِ الْعَشِیْرِ وَالتَّحْذِیْرُ مِنْ مُخَالَفَتِه وَ وُجُوْبُ شُکْرِ نِعْمَتِهٖ فیض القدیر۔ ۳۲۹/۵ (حدیث میں اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ شوہر کی نافرمانی نہ کی جائے، اس کی مخالفت سے منع کیا گیا ہے اور اس کی طرف سے حاصل سہولتوں پر شکر ادا کرنے کو لازم کیا گیا ہے)۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: فِیْهِ تَاْکِیْدُ حَقِّ الزَّوْجِ وَ حَثٌّ عَلٰی مَا یَجِبُ مِنْ بِرِّهٖ وَ وَفَاءِ عَهْدِهٖ وَالْقِیَامِ بِحَقِّهٖ، وَ لَهُنَّ عَلَی الْأَزْوَاجِ مَا لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ (حوالہ سابق) (اس حدیث میں شوہر کے حق پر زور دیا گیا ہے اور اس پر ابھارا گیا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کے عہد کو پورا کیا جائے اور اس کے حقوق ادا کیے جائیں۔ البتہ عورتوں کے بھی شوہروں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے شوہروں کے ان پر ہیں)۔ مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری نے لکھا ہے: فِیْ هٰذَا الْمُبَالَغَةُ لِوُجُوْبِ اِطَاعَةِ الْمَرْأَةِ فِیْ حَقِّ زَوْجِهَا۔ تحفة الأحوذی شرح ترمذی، مکتبہ اشرفیہ دیوبند، ۲۷۲/۴ (اس میں بڑے مبالغہ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ شوہر کے حق میں عورت کی اطاعت واجب ہے)۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام میں مردوں اور عورتوں کے درمیان کامل مساوات رکھی گئی ہے۔ ان کے انسانی حقوق برابر ہیں۔ ان کے سماجی حقوق میں بھی کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں اعمال کی جزا کے معاملے میں بھی کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نظامِ خاندان میں شوہر کو بیوی پر یک گونہ برتری دی گئی ہے، اسے گھر کا سربراہ بنایا گیا ہے اور بیوی کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ (البقرة:۲۲۸)

’’عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں، البتہ مردوں کو ان پر ایک (برتر) درجہ حاصل ہے۔‘‘

اس آیت کی تشریح میں مفسرین نے صراحت کی ہے کہ اطاعت میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ شوہر کی اطاعت بھی شامل ہے۔ (تفسیر طبری، ۸/ ۲۹۴، البحر المحیط لابی حیان، ۳/ ۳۳۷)

یہ تصور کہ مرد اور عورت کے درمیان ہر معاملے میں مساوات اور یکسانی ہے، حتیٰ کہ نظامِ خاندان میں بھی شوہر کو بیوی پر کوئی برتری نہیں اور بیوی سے شوہر کی اطاعت کا مطالبہ کرنا اس کی توہین وتذلیل ہے، یہ اصلاً مغربی تصور ہے، جو اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔

رہی دوسری حدیث تو اس پر بھی غور وخوض صحیح تناظر میں نہیں کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقے سے جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے نکاح کو مشروع کیا گیا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ آسان بنایا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں عورت کی مرضی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسے اختیار ہے کہ جس شخص کی چاہے نکاح کی پیش کش قبول کر لے، خواہ اس کی جو بھی سماجی حیثیت ہو اور اس کی معاشی تگ ودو کا جو بھی حال ہو۔ لیکن اگر عورت تیار نہ ہو تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ان بنیادی نکتوں کی طرف تو سائل کی توجہ مبذول نہ ہوسکی، دوسرے اشکالات ذہن میں ابھر آئے۔

یہ حدیث بخاری (۵۱۲۱)، مسلم (۱۴۲۵)، ابوداؤد (۲۱۱۱)، ترمذی (۱۱۱۴)، نسائی (۳۳۳۹) اور موطا امام مالک (۲۲۶۷) میں مروی ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کے اجزاء چودہ مقامات پر روایت کیے ہیں اور اس سے مختلف استنباطات کیے ہیں۔ چند استنباطات ملاحظہ ہوں:

- ۲۳۱۰، کتاب الوکالۃ، باب وکالۃ المرأۃ الامام فی النکاح یعنی سربراہِ حکومت نکاح میں عورت کا وکیل بن سکتا ہے۔

- ۵۰۷۱، کتاب النکاح، باب تزویج المعسر الذی معہ القرآن والاسلام یعنی اس غریب شخص کا نکاح کرا دینا چاہیے جسے قرآن کی سورتیں یاد ہوں اور وہ مسلمان ہو۔

- ۵۰۸۷، کتاب النکاح، باب تزویج المعسر لقولہ تعالیٰ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَاء

يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ یعنی غریب شخص کا نکاح کرادینا چاہیے، اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے اگر وہ غریب ہیں تو بعید نہیں کہ اللہ انھیں اپنے فضل سے مال دار کردے۔

- ۵۱۲۱، کتاب النکاح، باب عرض المرأة نفسها علی الرجل الصالح، یعنی عورت نیک مرد سے نکاح کی پیش کش کرسکتی ہے۔

- ۵۱۲۶، کتاب النکاح، باب النظر الی المرأة قبل التزویج، یعنی نکاح سے قبل عورت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

- ۵۱۴۹، کتاب النکاح، باب التزویج علی القرآن و بغیر صداق یعنی مرد کو قرآن یاد ہونے پر، بغیر مہر کے عورت کا نکاح اس سے کیا جاسکتا ہے۔

- ۵۱۵۰، کتاب النکاح، باب المهر بالعروض و خاتم من حدید، یعنی مہر کوئی سامان بھی ہوسکتا ہے، خواہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہو۔

اب ایک نظر اشکالات پر ڈال لینا مناسب ہے۔

یہ اشکال بے معنیٰ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس عورت سے نکاح کرنا نہیں چاہتے تھے تو اس کی مرضی معلوم کیے بغیر دوسرے شخص سے اس کا نکاح کیوں کرادیا؟ ایک روایت میں تفصیل ہے کہ آں حضرت ﷺ اس عورت کی پیش کش پر خاموش رہے تو وہ مجلس میں رکی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر اپنی بات دہرائی، آپؐ نے اس بار بھی کچھ نہیں فرمایا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے صراحت سے معذرت کردی تھی (مَالِي فِي النِّسَاءِ مِنْ حَاجَةٍ۔ بخاری:۵۰۲۹، مجھے اس وقت نکاح کی ضرورت نہیں) اس کے باوجود عورت وہاں سے نہیں گئی تھی۔ (بخاری:۵۱۴۹) اس لیے ایک صحابی نے اس سے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر وہ عورت خاموش رہی۔ آپؐ نے اس آدمی سے دریافت کیا: مہر میں کیا دوگے؟ اس نے کہا: میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپؐ نے اسے بھیجا کہ وہ کچھ لے کر آئے۔ وہ کچھ دیر کے بعد خالی ہاتھ واپس لوٹ آیا۔ اس عرصے میں وہ عورت وہیں بیٹھی رہی اور یہ واضح ہوجانے کے باوجود کہ یہ صاحب بالکل مفلس ہیں، اس سے نکاح پر اپنی عدم رضا کا اظہار نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ حدیث میں صراحت نہیں ہے کہ

اللہ کے رسول ﷺ نے کسی مرحلے پر عورت کی رائے معلوم کی ہو، لیکن قرینہ واضح دلیل ہے کہ ہر مرحلے پر عورت کی خاموشی اس کی رضا کی دلیل تھی۔ جو عورت بھری مجلس میں اپنے نکاح کی خواہش کا اظہار کرسکتی تھی وہ رشتہ پسند نہ آنے کی صورت میں صراحت سے انکار کرنے پر بھی قادر تھی۔ اس کا خاموشی سے بیٹھے رہنا، سلسلے کو آگے بڑھتے دیکھتے رہنا اور رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرا دینے کے بعد خاموشی سے اس آدمی کے ساتھ چلے جانا، اس کی رضا کی دلیل اور آں حضرت ﷺ پر بھرپور اعتماد کا مظہر تھا۔

شریعت میں مہر کی کیا حیثیت ہے؟ اس کی مشروعیت کی کیا حکمت ہے؟ اور اس کی کم از کم مقدار کیا ہوسکتی ہے؟ علماء نے اس پر طویل اور دقیق بحثیں کی ہیں۔ انھوں نے قرآن کے بیانات اور اس موضوع پر مختلف احادیث کو سامنے رکھ کر استنباطات کیے ہیں۔ ان کے نتائج فکر میں اختلاف ہوا ہے۔ فقہائے اربعہ میں امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک کم سے کم مالیت کی کوئی بھی چیز مہر بن سکتی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس کی مالیت کم سے کم تین درہم اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دس درہم ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے کتب فقہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن احادیث سے بہ ہر حال یہ ثابت ہے کہ عہد نبوی میں نہ صرف یہ کہ کم سے کم مالیت کی اور حقیر سے حقیر چیز کو بھی مہر سمجھ لیا گیا۔ زیر بحث واقعہ کے علاوہ حضرت ام سلیمؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ انھیں ابوطلحہؓ نے نکاح کا پیغام دیا۔ اس وقت تک وہ اسلام نہیں لائے تھے۔ حضرت ام سلیم نے جواب دیا: اے ابوطلحہؓ! آپ جیسوں کی پیش کش رد نہیں کی جاتی، لیکن آپ کافر ہیں اور میں مسلمان، اس لیے ہمارے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ اسلام لے آئیں تو یہی میرا مہر ہوگا، میں آپ سے اور کچھ نہ مانگوں گی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ ابوطلحہؓ نے اسلام قبول کرلیا۔ دونوں کے درمیان نکاح ہوگیا۔ اور ابوطلحہؓ کا قبول اسلام ہی ام سلیمؓ کا مہر قرار پایا۔ (نسائی: ۳۳۴۰)

زیر بحث حدیث میں یہ بھی ہے کہ ”جب آں حضرت ﷺ نے آدمی سے کہا کہ مہر کے نام پر کچھ بھی لے آؤ تو اس نے کہا: ”میرے پاس بس یہ تہبند ہے، اس کا نصف میں دے سکتا ہوں۔“ اسے بیہودہ مذاق وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو کوٹھیوں میں رہتے ہوں، بینک بیلنس کے مالک ہوں اور جنھیں اپنے سوٹوں کی گنتی بھی یاد نہ رہتی ہو۔ لیکن جن لوگوں کی نظر صحابۂ کرام کی

معاشرتی ومعاشی زندگی پر ہو وہ اسے حقیقت پر محمول کریں گے۔ صحابۂ کرام کی بڑی تعداد ایسی تھی، جو انتہائی غربت کی حالت میں زندگی گزارتی تھی۔ بسا اوقات فاقوں کی نوبت آجاتی تھی۔ ان کے جسموں پر پورے کپڑے نہ ہوتے تھے۔ اسی بنا پر مجلسوں میں شرم کے مارے وہ دوسروں کی اوٹ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں: جَلَسْتُ فِیْ عصابةٍ مِّنْ ضُعَفَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ اِنَّ بَعْضَهُمْ يَسْتَتِرُ بِبَعْضٍ مِنَ الْعُرَیٰ۔ ابوداؤد: ۳۶۶۶ (میں ایسے غریب مہاجرین کی جماعتوں کے ساتھ بیٹھا ہوں جو برہنگی کے سبب ایک دوسرے کی اوٹ لیتے تھے) زیر بحث حدیث کے راوی حضرت سہلؓ جب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس شخص نے اپنا تہبند دے دینے کی پیش کش کی تو ساتھ ہی یہ بھی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے پاس چادر نہیں تھی۔ (بخاری: ۵۱۲۱) گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر اس کے پاس چادر ہوتی تو وہ تہبند کے بہ جائے چادر دینے کی بات کہتا۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خود اس سے کہا تھا: اَعْطِهَا ثَوْبًا۔ بخاری: ۵۰۲۹ (اسے مہر میں کوئی کپڑا دے دو) تب اس نے تہبند دینے کی بات کہی تھی۔

نفقہ کو مہر پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ کوئی شخص کھانے پینے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اور جب وہ اپنا انتظام کرسکتا ہے تو اپنی بیوی کا بھی کرسکتا ہے۔ نکاح کی ذمّے داری ادا نہ کرسکنے کی صورت میں روزہ واجب نہیں، محض ایک تدبیر ہے اور روزہ چوبیس گھنٹے کا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں بھی کھانے پینے کا انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس واقعے میں قابل غور یہ بنیادی نکتہ ہے کہ اگر کوئی عورت اس قدر مفلس شخص کے ساتھ نکاح کرنے اور اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے پر رضامند ہے تو دوسرے کسی شخص کو اس کے ساتھ ہم دردی جتانے اور اس مفلس شخص کو اس سے نکاح کرنے سے روکنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟!!

شریعت میں مہر معجّل (فوری طور پر قابلِ ادا مہر) اور مہر موٴجّل (بعد میں قابلِ ادا مہر) دونوں صورتیں بتائی گئی ہے۔ لیکن ہندستانی مسلم معاشرے میں عموماً مہر موٴجل کی جو صورت اختیار کر لی گئی ہے وہ شریعت کا مذاق ہے۔ اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسے کبھی نہیں ادا کرنا ہے۔ اگر سمجھا نہیں گیا ہے تو عمل بہ ہر حال اسی پر ہے۔ شریعت میں مہر معجّل کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

صحابۂ کرام کا اسی پر عمل تھا۔ ان کے نزدیک اس کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص نکاح کرلے اور ادائی مہر کو آیندہ کے لیے ٹال دے۔

تشخص کا مسئلہ

سوال: ہمارے ملک اور دیگر ممالک میں بھی قبولِ اسلام کے واقعات آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے تو اپنا سابقہ تشخص بدل کر اسلامی نام، اسلامی لباس اور اسلامی وضع قطع اختیار کرلیتا ہے۔ بہ راہ کرم اس کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں۔ ایسا کرنا ضروری ہے یا یہ ایک غیر ضروری اور ناپسندیدہ عمل ہے؟ ایک مولانا صاحب ہیں جو اس کی بہت شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عمل نہ صرف غیر ضروری، بل کہ نقصان کی بات ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کا تشخص نہ بدلیں تو وہ اپنی سوسائٹی سے کٹتے نہیں اور بہ آسانی اس میں اشاعتِ اسلام کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ دلیل میں وہ سورۂ مومن میں مذکور 'مردِ مومن' کا کردار پیش کرتے ہیں۔ وہ مردِ مومن حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا تھا، مگر حضرت موسیٰ نے اس سے نام اور ظاہری تشخص بدلنے پر اصرار نہیں کیا اور وہ اپنے سابقہ نام اور سابقہ وضع قطع کے ساتھ دربارِ فرعون کا ممبر بنا رہا۔ اس بنا پر وہ ایک خاص موقع پر دربار فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی حمایت میں ایک اہم رول ادا کرنے کے قابل ہوسکا۔ ان خیالات کو پڑھ کر میں ایک عجیب ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ دعوتی کام کے سلسلے میں آج تک جو کوششیں ہوئی ہیں، کیا وہ سب غلط تھیں؟ غیر مسلموں میں جو کام ہو رہا ہے، کیا وہ بھی غلط انداز میں ہو رہا ہے؟ بہ راہ کرم مفصل اور اطمینان بخش جواب سے نوازیں۔

جواب: اس مسئلے پر درج ذیل نکات کی روشنی میں غور کرنا چاہیے:

۱- قبول اسلام کا تعلق اصلاً دل کی تبدیلی سے ہے۔ چند متعین عقائد پر آدمی کا دل مطمئن ہوجائے، وہ انھیں اپنا لے اور ان کو سچ جانے تو وہ مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں دو الفاظ مستعمل ہیں۔ ایمان اور اسلام۔ ایمان نام ہے ان عقائد کو سچ جاننے اور ماننے کا اور اسلام کہتے ہیں ان کا اقرار کرنے اور اللہ کے فرض کردہ احکام پر عمل کرنے کا۔ مشہور حدیثِ جبریل میں ہے: ''ایک مرتبہ مجلسِ نبوی میں حضرت جبریل علیہ السلام

ایک اجنبی شخص کے بھیس میں تشریف لائے اور نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا: ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ایمان یہ ہے کہ تم مانو اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو، روز آخرت کو اور تقدیر کے اچھے برے ہونے کو۔ انھوں نے پھر سوال کیا: اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو'' (صحیح مسلم: ۹) لیکن قرآن وحدیث میں دونوں الفاظ کا استعمال ہم معنی بھی ہوا ہے۔ اسی لیے عقائد کی کتابوں میں اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَ عَمَلٌ بِالْأَرْکَانِ ''زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور ارکان پر عمل۔''

۲- اندرونی تبدیلی بیرونی تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے۔ آدمی کا دل جس چیز کی گواہی دیتا ہو اور جسے سچ جانتا اور مانتا ہو، ضروری ہے کہ زبان بھی اس کا اقرار کرے اور اس کے ظاہر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہو۔ دل کا حال اللہ جانتا ہے، لیکن دنیا میں فیصلہ انسان کے ظاہری حال کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست میں یہ معاملہ بالکل ظاہر ہے کہ اس میں اگر کوئی شخص اسلامی احکام پر عمل نہیں کرے گا تو اس کا احتساب کیا جائے گا اور اگر جن کاموں سے روکا گیا ہے، ان کا ارتکاب کرے گا تو اس کی سرزنش کی جائے گی اور سزا دی جائے گی۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کے عہد میں لوگوں کی گرفت وحی کے ذریعے کی جاتی تھی۔ لیکن اب وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔ اب ہم تمھاری گرفت تمھارے ظاہری اعمال کو دیکھ کر کریں گے۔ جو شخص بہ ظاہر کوئی اچھا کام کرے گا، اس سے ہم کچھ تعرض نہ کریں گے اور اسے اپنے سے قریب رکھیں گے، اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش نہیں کریں گے، اس کے باطن کے معاملے میں اللہ اس کا محاسبہ کرے گا اور جو شخص ظاہر میں کوئی برا کام انجام دے گا، اسے ہم چین سے بیٹھنے نہ دیں گے اور نہ اسے سچا مانیں گے، خواہ وہ دعویٰ کرے کہ اس کا دل صاف اور اس کا باطن اچھا ہے۔ (صحیح

بخاری:۲۶۴۱) اسلامی ریاست نہ ہو تو بھی ضروری ہے کہ آدمی کا ظاہر اس کے مسلمان ہونے کی گواہی دے، تاکہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ مسلمان ہونے کی حیثیت سے معاملہ کریں، احکام اسلام پر عمل کرنے میں اس سے کوتاہی ہو تو اسے وعظ و نصیحت اور تفہیم و تلقین کریں اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ قرآن نے اہل ایمان کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ نہ صرف خود اچھے کام کرتے ہیں، بل کہ دوسرے اہل ایمان کو بھی حق اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ (العصر:۳)

۳- نام، وضع اور لباس وغیرہ انسان کی شخصیت کی پہچان کے مختلف ذرائع ہیں۔ ان میں سے کچھ تو عام ہیں کہ تمام مذاہب کے لوگ انھیں اختیار کرتے ہیں، لیکن کچھ اپنی مذہبی شناخت رکھتے ہیں۔ ایسے نام اختیار کرنا یا ایسے لباس پہننا جو کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ مخصوص ہوں، مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔ شریعت میں اس سے روکا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا۔ (ترمذی، ابواب الاستئذان والآداب:۲۶۹۵)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو غیروں سے مشابہت اختیار کرے۔''

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن یہ مضمون دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (ابوداؤد، کتاب اللباس:۴۰۳۱، مسند احمد:۲/۵۰)

''جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انھی میں سے ہے۔''

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: ''یعنی جس شخص نے مثلاً کفار سے مشابہت اختیار کرنے کی غرض سے انھی کی طرح کا لباس اختیار کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انھی کی طرح گنہ گار ہوگا۔'' (مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد، طبع سہارن پور:۵/۱۴)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے، جو عورت کی طرح لباس پہنتا ہے اور اس عورت پر لعنت فرمائی ہے جو مردانہ لباس پہنتی ہے۔

(بخاری، کتاب اللباس:۵۸۸۵، ابوداؤد، کتاب اللباس:۴۰۹۸)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''اس کا اطلاق ان جگہوں پر ہوگا جہاں مردوں اور عورتوں کے لباس میں فرق ہوتا ہے۔ لباس کی ہیئت کے معاملے میں ہر علاقے کے لوگوں کی عادتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض علاقوں کے مردوں اور عورتوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سب ایک طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ ان پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوگا۔''

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری، طبع بیروت: ۱۰/ ۳۳۲)

جب اسلامی شریعت اس قدر حساس ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کرنے اور ایک دوسرے کے مخصوص لباس استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو وہ دوسرے اہل مذاہب کی مشابہت اختیار کرنے اور ان کے جیسا لباس زیب تن کرنے کی کیوں اجازت دے سکتی ہے؟

۴- اسلام کا یہ اصولی حکم ہے جو عام حالات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا اطلاق جس طرح خاندانی اور موروثی مسلمانوں پر ہوگا، اسی طرح نئے اسلام قبول کرنے والوں پر بھی ہوگا کہ اگر ان کے نام، وضع قطع اور لباس ایسے ہوں کہ وہ ان کے سابقہ مذاہب کی پہچان ہوں تو انھیں بالکلیہ ترک کردیں یا ان میں ایسی تبدیلی کرلیں کہ ان کی قدیم مذہبی شناخت ختم ہوجائے۔ لیکن استثنائی حالات میں دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی رخصت دی گئی ہے۔

کسی مسلمان کے لیے عام حالات میں کلمۂ کفر زبان پر لانا جائز نہیں۔ جن لوگوں نے ایمان کو کھیل بنا رکھا ہو کہ کبھی ایمان کا اظہار کرتے ہوں اور کبھی کفر کا، ان کی سرزنش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّمۡ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغۡفِرَ لَهُمۡ وَلَا لِیَهۡدِیَهُمۡ سَبِیۡلًا ؕ۝

(النساء: ۱۳۷)

''جو لوگ ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔''

لیکن اگر کسی شخص کی جان پر بن آئی ہو، اسے ظلم کا نشانہ بنایا جارہا ہو اور اذیتیں دے کر کلمۂ کفر کو زبان سے ادا کرنے پر مجبور کیا جارہا ہو تو وہ اپنی جان بچانے اور ظلم سے نجات پانے کے لیے ایسا کرسکتا ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ (النحل:۱۰۶)

”جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کرلیا، اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

اسی طرح اگر کسی شخص کے اسلام قبول کرلینے کے نتیجے میں اسے قوی اندیشہ ہو کہ اس کے خاندان والے اسے ظلم وتشدد کا نشانہ بنائیں گے اور بہ جبر اس کو اس کے سابقہ مذہب میں واپس لانے کی کوشش کریں گے تو اسے اجازت ہوگی کہ وہ اپنے قبولِ اسلام کو اس وقت تک مخفی رکھے، جب تک کہ اپنے اہلِ خاندان یا دوسرے لوگوں کے ظلم و جبر اور تشدّد سے اپنی حفاظت کا کوئی مناسب انتظام نہ کرلے۔ یہی بات اس صورت میں بھی کہی جائے گی جب اسلام قبول کرنے والے کو قوی امید ہو کہ وہ اپنے قبول اسلام کو تھوڑی مدت مخفی رکھ کر اپنے متعلقین اور دوسرے اہلِ خاندان کی ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ سیرتِ نبوی میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کے اسلام قبول کرنے کے بعد کچھ عرصہ اسے پوشیدہ رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبول اسلام کے واقعے میں صراحت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: ”ابھی اپنے معاملے کو پوشیدہ رکھو اور اپنے وطن لوٹ جاؤ، جب میرے ظہور کی خبر پہنچے تب آجانا۔“ (مستدرک حاکم، طبع حیدرآباد: ۳/۳۳۹)

شاہِ حبشہ نجاشی اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لے آیا تھا، لیکن اس نے اپنے معاملے کو پوشیدہ رکھا، یہاں تک کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے اس

کے بارے میں توصیفی کلمات ادا فرمائے، استغفار کیا اور غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی۔

(بخاری: ۱۲۴۵، ۱۳۱۸، ۱۳۲۷، ۳۸۸۹، ۳۸۸۱ اور دیگر کتبِ حدیث)

۵- قرآن کریم کی سورۂ مومن میں فرعونِ مصر کے دربار سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کا جو تذکرہ آیا ہے اس کا تعلق بھی استثنائی اور غیر معمولی حالات سے ہے۔ فرعون کا ظلم و ستم معروف تھا، وہ عوام پر سخت مظالم ڈھاتا اور انھیں شدید تکلیفیں دیتا تھا۔ (البقرۃ: ۱۴۹ ابراہیم: ۶، القصص: ۴) جادوگروں کے قبولِ اسلام پر اس نے دھمکی دی تھی کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ (الاعراف: ۱۲۴، طٰہٰ: ۲۰، الشعراء: ۲۶) اس لیے دربارِ فرعون سے وابستہ اس شخص نے قبول اسلام کے بعد اپنے معاملے کو کچھ عرصہ مخفی رکھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازشیں جب اس کے سامنے کی جانے لگیں تو اس کا پیمانۂ صبر چھلک گیا اور اس نے اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے قبولِ اسلام کو ظاہر کر دیا۔ قرآن اس شخص کے ایمان چھپانے کی صراحت کرتا ہے:

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ (المومن: ۲۸)

"(اس موقع پر) آل فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، بول اٹھا..."

قرآن کا یہ بیان دلالت کرتا ہے کہ اس واقعے کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے۔ اپنے افکار و خیالات کو آدمی اسی صورت میں چھپاتا ہے، جب ان کے اظہار پر اسے کسی طرح کا ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ دربارِ فرعون کے مردِ مومن کا بھی یہی کیس تھا۔

۶- یہ کہنا کہ اسلام قبول کرنے والوں کا تشخص بدلنے سے ان کا دعوتی رول بالکل ختم ہو جاتا ہے، اگر وہ اپنے سابقہ تشخص کو باقی رکھیں تو اپنی سوسائٹی میں زیادہ آسانی سے اشاعت اسلام کا کام انجام دے سکتے ہیں، محض خام خیالی ہے۔ اس کے برخلاف سابقہ تشخص برقرار رہنے سے اس بات کا اندیشہ قائم رہتا ہے کہ آدمی سابقہ غیر اسلامی ماحول اور سوسائٹی کا جز بنا رہے یا دوسروں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں کام یاب ہونے کے بہ جائے سابقہ مذہب کی طرف دوبارہ اس کا میلان ہو جائے۔ دوسری

طرف مختلف ممالک اور اپنے ملک میں بھی ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ اسلام قبول کرنے اور اپنا ظاہری تشخص بدل لینے کے باوجود آدمی اپنی سوسائٹی اور خاندان سے کٹا نہیں، بل کہ ان میں سے بہت سوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا۔

معرکۂ قسطنطنیہ میں حضرت یزید کی سربراہی؟

ایک صاحب لکھتے ہیں:

ماہ نامہ زندگی نو، اکتوبر ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا ایک مضمون حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی سیرت پر شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی ایک عبارت (ص:۱۷) سے متعلق کچھ وضاحت مطلوب ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے:

> ''حضرت یزید بن معاویہؓ کی سربراہی میں قسطنطنیہ کی اس مہم میں بھی انھیں شرکت کا شرف حاصل ہے، جس میں شریک رہنے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ البتہ زمانۂ فتنہ (جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ) میں وہ الگ تھلگ رہے اور کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا۔''

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جنگِ قسطنطنیہ، جس میں یزید مذکور شریک تھا، وہ جنگ نہیں ہے جس میں شریک مسلمانوں کو جنت یا بخشش ونجات کی بشارت دی گئی ہے۔ پھر بھی اگر مضمون نگار کا خیال صحیح ہے تو بہ راہِ کرم دلائل سے وضاحت فرمائیں، نوازش ہوگی۔ بہ راہ کرم یہ بھی وضاحت فرمائیں کہ کیا یزید صحابی تھا اسی لیے مضمون میں اسے 'حضرت یزید بن معاویہؓ' لکھا گیا ہے؟ یعنی اللہ اس سے راضی ہوا۔ کیا زمانۂ فتنہ جنگ جمل اور جنگ صفین ہی کا زمانہ تھا؟ اس کے بعد کا زمانہ نہیں تھا؟ اگر نہیں تو کیا زمانہ امن وسلامتی وہدایت کے اعتبار سے راہِ نبوت وخلافتِ راشدہ پر لوٹ آیا تھا؟ یعنی اموی وعباسی زمانہ زمانۂ فتنہ نہ تھا۔ اگر حضرت معاویہؓ کا دور، جس میں یزید بھی قسطنطنیہ کی جنگ میں بہ طور سربراہ شریک تھا، زمانۂ فتنہ نہ تھا اور فتنے کے زمانے سے نکل آیا تھا تو پھر اسے خلافت راشدہ کے دور سے تعبیر کیوں نہیں کیا جاتا؟ اگر دونوں زمانوں میں فرق تھا، جس کی وجہ سے دورِ خلافتِ معاویہ کو خلافتِ راشدہ کا دور نہیں قرار دیا جاتا تو وہ فرق کیا تھا؟

کیا جنگِ قسطنطنیہ ہی وہ پہلی بحری جنگ ہے جس کے متعلق ہمارے مقررین ومصنفین

یہ فرماتے ہیں کہ پہلی بحری جنگ میں جو لوگ شریک ہوں گے اللہ نے انھیں بخش دیا۔ اس لیے 'حضرت یزید رضی اللہ عنہ' بھی بخشے گئے؟ کیا قسطنطنیہ میں یہی ایک جنگ ہوئی جس میں یزید بن معاویہ شریک ہوا تھا یا سربراہ تھا؟

ایک صاحب اپنی ایک مشہور ترین کتاب میں کعب احبار کو باقاعدہ 'کعب احبارؓ' لکھتے ہیں، جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی صحابی تھے۔ کیا یہ صحابی تھے؟ اس لیے شناخت کے لیے ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا جانا چاہیے، جیسا کہ مضمون مذکور میں یزید بن معاویہ کے نام کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ تفصیلی وضاحت سے نواز کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

جواب: حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے صاحب زادے حضرت یزید کی ولادت باختلافِ روایات ۲۵ھ یا ۲۶ھ یا ۲۷ھ میں ہوئی (ابنِ کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث، قاہرہ، ۱۹۸۸ء، ۸/ ۲۲۹) اس سے معلوم ہوا کہ وہ صحابی نہیں، بل کہ تابعی ہیں۔ تاریخِ اسلام میں ان کی شہرت اس اعتبار سے ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں انھیں اپنے بعد خلیفہ بنائے جانے کے لیے نام زد کر دیا تھا۔ چناں چہ حضرت معاویہؓ کی وفات (۶۰ھ) کے بعد انھوں نے تقریباً چار سال حکم رانی کر کے ۶۴ھ میں وفات پائی۔ انھی کے عہدِ خلافت میں ۶۱ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کا الم ناک واقعہ پیش آیا اور ۶۳ھ میں واقعۂ حرہ پیش آیا، جس میں اہلِ مدینہ کی بڑی تعداد، جس میں بہت سے جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی تھے، مقتول ہوئی۔ ان الم ناک واقعات نے حضرت یزید کی شخصیت پر بدنامی کا داغ لگا دیا۔

سیاسی اسباب سے حضرت یزید کی شخصیت متنازعہ رہی ہے۔ کتب تاریخ میں ان پر بہت سے الزامات لگائے گئے ہیں، جن میں سے بیش تر تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے۔ یہ موقع ان کے محاکمے کا نہیں ہے۔ بہ ہر حال بعض صحیح احادیث سے حضرت معاویہؓ اور ان کے صاحب زادے حضرت یزید کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک درج ذیل حدیث ہے:

حضرت ام حرامؓ (جو حضرت عبادہ بن صامتؓ کی بیوی ہیں) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَوَّلُ جَیْشٍ مِّنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْنَ الْبَحْرَ قَدْ اَوْجَبُوْا (میری

امت کا پہلا لشکر جو بحری جنگ میں حصہ لے گا اس کے لیے جنت کی بشارت ہے۔) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ فرمایا: ہاں، تم بھی ان میں سے ہو۔'' آپؐ نے فرمایا: اَوَّلُ جَیْشٍ مِّنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْنَ مَدِیْنَۃَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّھُمْ (میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (یعنی روم) پر حملہ آور ہوگا اس کی بخشش کردی گئی) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔''

(صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب ما قیل فی قتال الروم، حدیث نمبر: ۲۹۲۴)

بعض دیگر روایات میں اس حدیث کا پس منظر تفصیل سے مذکور ہے۔ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ آں حضرت ﷺ حضرت ام حرامؓ کے گھر وقتاً فوقتاً جایا کرتے تھے۔ ان کے یہاں کھانا تناول فرماتے اور کچھ دیر آرام کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر ان کے یہاں استراحت کے دوران آپ کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے ایک خواب دیکھا۔ آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے اور وہ بشارت سنائی جو پہلے مذکور ہے۔ پھر دوبارہ سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد ہنستے ہوئے بیدار ہوئے تو دوسری بشارت سنائی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ام حرامؓ کے دوبارہ سوال کرنے پر آپؐ نے فرمایا: ''اَنْتَ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ'' (تم پہلے لشکر کے ساتھ ہوگی)۔

(صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الدعاء بالجهاد والشهادة للرجال والنساء، حدیث نمبر: ۲۷۸۸، و دیگر مقامات، صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضل الغزو فی البحر، حدیث نمبر: ۱۹۱۲)

اس حدیث میں جن دو جنگوں کا تذکرہ ہے، تاریخ سے ثابت ہے کہ ان میں سے ایک حضرت معاویہؓ کی سربراہی میں لڑی گئی تھی اور دوسری ان کے صاحب زادے حضرت یزید کی سربراہی میں۔ پہلی جنگ ۲۷ھ یا ۲۸ھ میں ہوئی تھی، جب حضرت معاویہؓ خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہدِ خلافت میں شام کے گورنر تھے۔ انھوں نے حضرت عثمان کی اجازت سے بحری بیڑہ تیار کرکے رومیوں سے جنگ کی اور جزیرۂ قبرص پر قبضہ کرلیا۔ اس جنگ میں حضرت ام حرامؓ بھی اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ شریک تھیں۔ دورانِ معرکہ ایک موقع پر وہ اپنی سواری سے گر گئیں جس سے ان کی وفات ہوگئی۔ دوسری بحری جنگ حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں رومیوں سے ہوئی۔ اس میں اسلامی لشکر کی سربراہی حضرت

یزید کر رہے تھے۔ اس جنگ میں حضرات صحابہ میں ابنِ عمر، ابنِ عباس، ابنِ زبیر اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم بھی شریک تھے۔ اسی جنگ کے دوران حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی وفات ہوگئی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ، حوالہ سابق، ۸/ ۳۴، ۲۳۲)

اسی وجہ سے مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے مہلبؒ کے واسطے سے لکھا ہے:

''اس حدیث میں منقبت ہے حضرت معاویہؓ کے لیے، کیوں کہ انھوں نے ہی سب سے پہلے بحری جنگ کی تھی، اور ان کے بیٹے یزید کے لیے بھی منقبت ہے، کیوں کہ اسی نے سب سے پہلے قیصر روم کے شہر پر حملہ کیا تھا۔'' (فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ، بیروت، ۶/ ۱۰۲)

حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہدِ خلافت تک امتِ مسلمہ متحد تھی۔ ان کے آخری زمانے میں فتنے ابھرے اور امت اختلاف و انتشار کا شکار ہوگئی۔ ان کی شہادت (۳۵ھ) کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؓ خلیفہ بنائے گئے۔ لیکن ان کی خلافت پر تمام لوگوں کو اتفاق نہ تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے قاتلینِ عثمانؓ سے بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ اس کے نتیجے میں ان کے حامیوں اور حضرت علیؓ کی فوج کے درمیان بصرہ کے قریب جمادی الآخری ۳۶ھ میں جنگ ہوئی۔ اسے جنگِ جمل کہتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد صفّین کے مقام پر صفر ۳۷ھ میں حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ان دونوں جنگوں میں دونوں طرف مسلمان تھے۔ بعد میں حضرت علیؓ کی خوارج سے بھی، جو بھٹکے ہوئے مسلمان تھے، متعدد جنگیں ہوئیں۔ ۴۰ھ میں ان کی شہادت کے بعد حضرت حسن بن علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد انھوں نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر لی اور خلافت سے دست بردار ہوگئے۔ اس طرح پوری مملکتِ اسلامیہ ایک خلیفہ کے ماتحت آگئی۔ مذکورہ جنگوں میں چوں کہ دونوں طرف مسلمان تھے، اس لیے بہت سے صحابہ و تابعین نے کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا اور ان جنگوں سے کنارہ کش رہے۔ ان میں سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی تھے۔ مضمون میں یہ بحث نہیں کی گئی ہے کہ اسلامی تاریخ کے کن کن ادوار کو زمانۂ فتنہ کہا جا سکتا ہے؟ بل کہ صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ان جنگوں میں، جن میں دونوں طرف مسلمان تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے شرکت نہیں کی۔ بعد میں جب امت ایک خلیفہ پر متفق ہوگئی تو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ پھر جہاد میں شریک ہونے لگے۔

مذکورہ بالا حدیث میں جن بشارتوں کا تذکرہ ہے ان کا مصداق حضرت معاویہؓ اور

حضرت یزید کو قرار دینا قیاسی و استنباطی ہے۔ فاضل مراسلہ نگار یا دوسرے محققین ان کے علاوہ دوسری شخصیات کو ان کا مصداق سمجھتے ہوں تو انھیں اختیار ہے۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت یزید اپنے اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ اللہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ وہ جیسا چاہے گا ان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔ ہم اپنی پارسائی کے ہزار دعووں کے باوجود ان کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔ ہمیں اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

حضرت یزید تابعی ہیں، ان کے نام پر رضی اللہ عنہ کا نشان غلط لگ گیا ہے۔ ویسے متقدمین 'رضی اللہ عنہ' کو حضرات صحابہ کے لیے خاص نہیں کرتے تھے، بل کہ بعد کی شخصیات کے لیے بھی اس کا استعمال کرتے تھے۔ حضرت کعب احبار بھی تابعی ہیں۔ عہدِ نبویؐ میں موجود تھے، لیکن صحیح روایت کے مطابق قبولِ اسلام کی سعادت حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں حاصل ہوئی۔ اس سے قبل یہود کے جید علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے واسطے سے بہت سی اسرائیلی روایات اسلامی لٹریچر میں داخل ہوگئیں، جنھیں ائمہ حدیث ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔ ۳۲ھ میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں شام میں ان کی وفات ہوئی۔

(۲)

معرکۂ قسطنطنیہ کی سربراہی سے متعلق مراسلہ نگار کے شبہات پر راقم سطور نے جو وضاحت کی تھی، اس سلسلے میں موصوف نے مزید کچھ معروضات پیش کیے ہیں۔ استنباط کا فرق اور نقطۂ نظر کا اختلاف عین ممکن ہے۔ لیکن چوں کہ موصوف کے یہ معروضات زیرِ بحث حدیث کے سلسلے میں قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے ہیں، اس لیے مختصر وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

راقم نے یہ حدیث نقل کی تھی:

حضرت امِ حرامؓ (حضرت عبادہ بن صامتؓ کی بیوی) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَوَّلُ جَیْشٍ مِّنْ اُمَّتِی یَغْزُوْنَ الْبَحْرَ قَدْ اَوْجَبُوا (میری امت کا پہلا لشکر جو بحری جنگ میں حصہ لے گا اس کے لیے جنت کی بشارت ہے۔)، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ فرمایا: ہاں تم بھی ان میں سے ہو۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اَوَّلُ جَیْشٍ مِّنْ اُمَّتِی یَغْزُوْنَ مَدِیْنَةَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ (میری امت کا

پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (یعنی روم) پر حملہ آور ہوگا اس کی بخشش کردی گئی) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب ما قیل فی قتال الروم، حدیث: ۲۹۲۴)

اس حدیث کے سلسلے میں موصوف نے اپنے معروضات میں چند اشکالات پیش کیے ہیں۔ ان کا پہلا اشکال یہ ہے کہ ''نہ تو پہلی جنگ میں روم کا تذکرہ ہے اور نہ ہی دوسری جنگ کے تعلق سے روم کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ دوسری جنگ کے تعلق سے بحری جنگ ہونے کی بھی وضاحت نہیں ہے۔ پھر بھی جناب مضمون نگار اس دوسری جنگ کو بحری جنگ قرار دینے پر مصر ہیں۔''

موصوف کو یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ ان کے پیشِ نظر حدیث کا صرف یہی متن ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری (متعدد مقامات) کے علاوہ صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں بھی مروی ہے۔ اگر وہ ان تمام مقامات کو ملاحظہ کرلیتے تو ان کی غلط فہمی دور ہوجاتی۔ ذیل میں مختلف مقامات کے الفاظِ حدیث نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے پہلی اور دوسری، دونوں جنگوں کے لیے یہ الفاظ استعمال فرمائے تھے۔ نَاسٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عُرِضُوْا عَلَیَّ غُزَاةً فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ، یَرْكَبُوْنَ ثَبَجَ هٰذَا الْبَحْرِ مُلُوْكًا عَلَی الْاَسِرَّةِ۔ (کتاب الاستئذان، باب من زار قوماً فقال عندهم، ۲۲۸۲) ''میری امت کے کچھ لوگ میرے سامنے پیش کیے گئے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے سمندر پر اس طرح سوار ہوں گے جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہیں۔''

(۲) دوسری متعدد احادیث میں پہلی جنگ کے لیے وہی الفاظ مذکور ہیں جو اوپر درج کیے گئے اور دوسری جنگ کے لیے مختصراً یہ الفاظ ہیں: نَاسٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عُرِضُوْا عَلَیَّ غُزَاةً فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ ساتھ ہی ہر روایت میں راوی نے یہ بھی صراحت کی ہے: ''كَمَا قَالَ فِی الْاُوْلٰی'' یعنی رسول اللہ نے دوسری جنگ کے لیے وہی بات فرمائی تھی جو پہلی جنگ کے لیے فرمائی تھی۔'' (بخاری: ۲۷۸۸، ۷۰۰۲، مسلم: ۱۹۱۲، ترمذی: ۱۶۴۵، نسائی: ۳۱۷۱، موطا: ۱۹۳۱)

(۳) متعدد روایات میں دوسری جنگ کے لیے رسول اللہ ﷺ کے الفاظ صراحت سے مذکور نہیں ہیں، بل کہ راوی نے یہ ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے اس موقع پر بھی وہی بات دہرائی تھی جو پہلی مرتبہ فرمائی تھی: ثُمَّ نَامَ فَاسْتَیْقَظَ وَ هُوَ یَضْحَکُ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِکَ / مِثْلَ مَقَالَتِهٖ۔ (بخاری:۲۷۹۹، ۲۸۷۷، ۲۸۹۴، مسلم:۱۹۱۲، نسائی:۳۱۷۲)

اس تفصیل سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(الف) بخاری کی حدیث ۲۹۲۴ اور دیگر احادیث، جنھیں اوپر ذکر کیا گیا ہے، سب حضرت ام حرامؓ سے مروی ہیں اور سب میں ایک ہی موقع کا بیان ہے، اگرچہ تعبیرات بدلی ہوئی ہیں۔

(ب) رسول اللہ ﷺ کی دونوں پیشین گوئیاں بحری جنگوں سے متعلق ہیں۔ اسی لیے محدثین کرام نے ترجمة الباب میں اس کی صراحت کی ہے۔ بخاری: باب رکوب البحر، مسلم: باب فضل الغزوۃ فی البحر، ترمذی: باب ماجاء فی غزوۃ البحر، نسائی: باب فضل الجهاد فی البحر۔

(ج) آں حضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق حضرت امِ حرامؓ کو صرف پہلی بحری جنگ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، دوسری میں نہیں۔ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلی بحری جنگ، جس میں حضرت امِ حرامؓ شریک ہوئی تھیں، وہ ہے جو ۲۷ھ یا ۲۸ھ میں حضرت معاویہؓ نے رومیوں سے کی تھی۔ (ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، طبع قاہرہ ۱۹۸۸ء، ۸/۳۴) یہی صراحت احادیث میں بھی ملتی ہے: فَخَرَجَتْ مَعَ زَوْجِهَا عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ غَازِیًا اَوَّلَ مَا رَکِبَ الْمُسْلِمُوْنَ الْبَحْرَ مَعَ مُعَاوِیَةَ۔ (بخاری:۲۷۹۹)

دوسری بحری جنگ میں مسلم لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔ یہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ تھا، جو ۴۹ھ میں انجام دیا گیا تھا۔ اس سال کے اہم واقعات کے ضمن میں مورخ ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے: فِیهَا غَزَا یَزِیْدُ بْنُ مُعَاوِیَةَ بِلَادَ الرُّوْمِ حَتّٰی بَلَغَ قُسْطُنْطُنِیَةَ...... فَکَانَ هٰذَا الْجَیْشُ اَوَّلُ مَنْ غَزَاهَا۔ البدایة والنهایة، ۸/۳۴ (اس سال یزید بن معاویہ نے بلادِ روم پر حملہ کیا، یہاں تک کہ قسطنطنیہ پہنچ گیا...... یہ پہلا لشکر تھا جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا تھا)

موصوف کا دوسرا اشکال یہ ہے کہ "حدیث میں قیصر کے شہر یعنی روم پر حملے کی بات کہی گئی ہے تو اس سے مراد قسطنطنیہ کی جنگ کیسے ہو سکتی ہے؟ اس سے شہنشاہِ روم قیصر کے زیر اقتدار کوئی دوسرا شہر بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔" آگے فرماتے ہیں: "واضح رہے کہ کسی شہر قیصر پر پہلا حملہ کرنے والا پہلا اسلامی لشکر وہ تھا جس نے عہد نبوی میں شام کے علاقے 'موتہ' میں لشکرِ روم کے مقابلے میں دادِ شجاعت پیش کی تھی۔ اور جنگِ قسطنطنیہ سے پہلے کئی بحری جنگیں ہو چکی تھیں، مثلاً عہد نبوی میں فتح مکہ کے بعد جدہ کی بندرگاہ پر حملہ اور عہدِ فاروقی میں ایران اور ہندوستان کے سواحلی علاقوں پر بحری حملے۔"

یہ اشکال بھی درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ:

(۱) اوپر یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ حدیث کے مطابق دوسری جنگ بھی بحری جنگ ہے۔ اس لیے اس کا مصداق غزوۂ موتہ کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ بحری جنگ نہ تھی۔

(۲) پہلی بحری جنگ، جس میں حضرت ام حرامؓ کے شریک ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی کی تھی، ۲۷ھ یا ۲۸ھ میں ہوئی تھی۔ اس لیے 'دوسری بحری جنگ' کا مصداق ان معرکوں کو قرار دینا صحیح نہیں جو عہدِ نبوی یا عہدِ فاروقی میں پیش آئے تھے۔ بل کہ کسی ایسی جنگ پر ہی اس کا اطلاق مناسب معلوم ہوتا ہے، جو اس کے بعد ہوئی ہو۔

(۳) 'مدینۃ قیصر' سے شہنشاہِ روم قیصر کی حدودِ مملکت کا کوئی بھی شہر مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ طرزِ تعبیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد کوئی مخصوص شہر ہے۔ چناں چہ محدثین نے اس سے رومی سلطنت کا دار الحکومت قسطنطنیہ مراد لیا ہے۔ (ابن حجر عسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ بیروت، ۶/ ۱۰۲، بدر الدین عینی، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر ۱۲/ ۱۰)

موصوف کا تیسرا اشکال یہ ہے کہ "اگر بالفرض مان لیا جائے کہ مذکورہ حدیث قسطنطنیہ ہی سے متعلق ہے تو یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ اس پر پہلا حملہ کرنے والا یزید ہے۔ اس لیے کہ یزید کا قسطنطنیہ پر حملہ ۴۹ھ-۵۵ھ کے درمیانی عرصے میں ہوا تھا، جب کہ قسطنطنیہ پر اس سے پہلے حضرت عبد الرحمٰن بن خالد بن الولید کی سپہ سالاری ہی میں حملہ ہو چکا تھا، جیسا کہ ابو داؤد کی ایک

حدیث میں صراحت ہے اور حضرت عبد الرحمٰن کا انتقال ۴۶ھ/ ۴۷ھ میں ہو گیا تھا۔'' مزید فرماتے ہیں: ''ابو داؤد شریف صحاحِ ستہ میں سے ہے۔ عام تاریخ کی کتابوں کے مقابلے میں اس کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔''

سنن ابی داؤد کی جس حدیث کی جانب موصوف نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے۔ حضرت اسلم ابو عمران فرماتے ہیں:

غَزَوْنَا مِنَ الْمَدِيْنَةِ نُرِيْدُ الْقُسْطُنْطُنِيَةَ وَ عَلَى الْجَمَاعَةِ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ، وَالرُّوْمُ مُلْصِقُو ظُهُوْرِهِمْ بِحَائِطِ الْمَدِيْنَةِ، فَحَمَلَ رَجُلٌ عَلَى الْعَدُوِّ فَقَالَ النَّاسُ مَهْ مَهْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يُلْقِيْ بِيَدَيْهِ اِلَى التَّهْلُكَةِ فَقَالَ اَبُوْ اَيُّوْبُ......

قَالَ اَبُوْ عِمْرَانَ فَلَمْ يَزَلْ اَبُوْ اَيُّوْبَ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى دُفِنَ بِالْقُسْطُنْطُنِيَةِ۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی قوله تعالیٰ ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة، حدیث: ۲۵۱۲)

''قسطنطنیہ پر حملہ کے ارادے سے ہم مدینے سے نکلے۔ لشکر کے سپہ سالار عبد الرحمٰن بن خالد بن الولید تھے۔ رومی شہر قسطنطنیہ کی فصیل کی جانب اپنی پیٹھ کیے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے دشمن پر زبردست حملہ کیا تو لوگ کہنے لگے: یہ کیا؟ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، یہ شخص خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ اس پر ابو ایوبؓ نے فرمایا......

ابو عمران کہتے ہیں: ابو ایوبؓ برابر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی اور قسطنطنیہ ہی میں ان کو دفن کر دیا گیا۔''

اس روایت میں حضرت ابو ایوبؓ کی وفات کا بھی ذکر ہے، جب کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان کی وفات اس جنگ میں ہوئی تھی جس کے سپہ سالار حضرت یزید تھے۔ اس تعارض کو موصوف نے یوں دور کیا ہے: ''رہی بات یہ کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا انتقال اس جنگ میں ہوا جس کا سپہ سالار یزید تھا تو اس میں بھی کوئی خلجان نہیں۔ اس لیے کہ قسطنطنیہ کا پہلا حملہ حضرت عبد الرحمٰن بن خالد کی سرکردگی میں ہوا۔ آپ اس میں شریک رہے، پھر بعد میں اس لشکر میں شریک ہوئے جس کا سپہ سالار یزید تھا تو قسطنطنیہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔''

موصوف کا یہ اشکال بھی متعدد غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

(۱) دراصل حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں رومی سلطنت پر حملہ کا آغاز ۴۴ھ سے کیا گیا تھا۔ اس موقع پر حضرت معاویہؓ کا ارادہ دارالحکومت قسطنطنیہ کو زیر کرنے کا تھا۔ بری فوج کی قیادت حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کر رہے تھے۔ یہ حملہ ۴۶ھ تک جاری رہا۔ لیکن اس موقع پر مسلم افواج (بری اور بحری دونوں) قسطنطنیہ تک نہیں پہنچ سکیں اور اہلِ روم کی مزاحمت سے راستے ہی سے واپس آ گئیں۔ حمص واپس آ کر حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کی وفات ہو گئی۔

(۲) ۴۹ ہجری میں دوبارہ حملہ کیا گیا۔ اس موقع پر بحری فوج کی قیادت طبری کے مطابق حضرت یزید بن معاویہ اور ابن اثیر کے مطابق حضرت سفیان بن عوف کر رہے تھے اور حضرت یزید اس فوج میں شامل تھے۔ اس موقع پر مسلم فوج قسطنطنیہ تک پہنچ گئی تھی اور اس نے طویل عرصے تک اس کا محاصرہ بھی کیے رکھا تھا، مگر اسے فتح نہیں کر سکی تھی۔

(۳) سنن ابی داؤد کی روایت میں راوی نے دو الگ الگ مواقع کے بیانات کو یکجا کر دیا ہے اور ایسا احادیث میں بار بار ہوا ہے۔ ابتدائی حصے کا بیان ۴۴ ہجری کا ہے، جب فوج مدینے سے روانہ ہوئی تھی اور اس کی سپہ سالاری حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کر رہے تھے۔ بقیہ حصے کا بیان ۴۹ھ کا ہے، جب مسلم فوج نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اسی موقع پر حضرت ابوایوبؓ کی وفات ہوئی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ قسطنطنیہ کا محاصرہ مسلم فوج نے ۴۹ھ میں کیا تھا، جب کہ حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کی وفات ۴۶ھ میں ہو چکی تھی۔

(۴) ارشاداتِ رسول کی صحت کے معاملے میں یقیناً کتبِ حدیث کو تاریخ کی عام کتابوں کے مقابلے میں ترجیح دی جائے گی، لیکن تاریخی واقعات کے اثبات کے لیے ایسا ضروری نہیں ہے۔ بل کہ وہ چاہے کتبِ احادیث میں ہوں یا کتبِ تاریخ میں، ان کی جانچ پرکھ کی جائے گی اور اس کے بعد ہی ان کی صحت یا عدمِ صحت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

(۵) سنن ابی داؤد کی روایت کی رو سے اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن خالد

کی سپہ سالاری میں مسلم فوج قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگئی تھی، تو یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بری افواج کے سربراہ تھے، جو موسمِ سرما میں جنگی سرگرمیاں انجام دیتی تھیں۔ (طبری، ابنِ کثیر اور ابنِ اثیر تینوں مورخین نے اس کی صراحت کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے طبری، تاریخ الرسل والملوک، المعروف بتاریخ الطبری، دار المعارف مصر: ۵ / ۲۱۲، ۲۲۶، ۲۲۷، ابنِ کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۸ / ۳۲، ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۶ء، ۳ / ۲۲۵، ۲۲۷ - ۲۲۸) جب کہ حدیث میں مغفرت کی بشارت قسطنطنیہ پر حملہ آور بحری فوج کے لیے ہے۔

آخر میں محترم مراسلہ نگار سے گزارش ہے کہ محض شبہات اور اشکالات پیدا کرنے اور دلیل میں اخبارات (اردو ٹائمز اور ہفت روزہ نشیمن) کے حوالے پیش کرنے پر اکتفا نہ کریں، بل کہ کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ سے بہ راہِ راست استفادہ کر کے صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ واللّٰہ یھدی الی سواء السبیل۔

صحابۂ کرامؓ کے کرداروں پر مبنی اداکاری

سوال: میرے موضع میں کچھ حضرات ویڈیو ٹیپ لائے ہیں، جن میں جنگِ بدر اور کچھ دوسرے غزوات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ صحابۂ کرامؓ دکھائے گئے ہیں۔ البتہ حضور ﷺ کی شبیہ دکھانے سے احتراز کیا گیا ہے۔ آواز سنائی گئی ہے۔ لوگ بڑی عقیدت سے اسے دیکھتے ہیں۔ کیا ایسے کیسٹ بنانا اور دیکھنا مناسب ہے؟ جب کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ ایسی منظر کشی میں کیسٹ بنانے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کی آمیزش کر لے۔

بہ راہِ کرم اس مسئلے پر مدلل اظہار فرمائیں۔ کیا صرف حضورؐ کی شبیہ کو دکھانا ہی قابلِ اعتراض ہے یا صحابۂ کرامؓ کی منظر کشی بھی نہیں ہونی چاہیے؟

جواب: کسی واقعے کے بارے میں پڑھ کر یا سن کر انسان پر جو تاثر قائم ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ اثر وہ اس وقت لیتا ہے جب اسکرین پر اسے رونما ہوتے ہوئے اور اس کے کرداروں کو متحرک اور چلتا پھرتا دیکھتا ہے۔ اسی بنا پر تعلیمی اور تفریحی مقاصد سے ٹیلی ویژن کا بہت بڑے پیمانے پر استعمال ہونے لگا ہے اور تاریخی واقعات کو اسٹیج کر کے ویڈیو کے ذریعے

دکھایا جانے لگا ہے۔ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا عہد نبوی کے واقعات کو بھی اسی طرح ٹی وی اور ویڈیو کے ذریعے دکھایا جاسکتا ہے اور کیا اللہ کے رسول ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے کردار کو ان پر پیش کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں تمام علماء کا اس بات پر اتفاق واجماع ہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ اور دیگر پیغمبروں کے کرداروں کی اداکاری جائز نہیں، اس لیے کہ یہ ان کے احترام وعقیدت کے منافی ہے۔ بعض علماء پیغمبروں کے ساتھ خلفائے راشدین اور اکابر صحابہؓ کی اداکاری کو ناجائز کہتے ہیں، لیکن دیگر صحابہ کے کرداروں کو اسٹیج پر پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، جب کہ بعض دیگر علماء کسی بھی صحابی کے کردار کی اداکاری کو جائز نہیں قرار دیتے۔

کچھ عرصہ قبل مصر میں اس موضوع پر کافی مباحثہ ہو چکا ہے۔ وہاں کے ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ نے عشرۂ مبشرہ (وہ دس صحابہ جنھیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی) کے علاوہ باقی صحابۂ کرام کا تمثیلی کردار پیش کرنے کی اجازت دی تھی، لیکن جامعۂ ازہر کے علماء کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اس معاملے میں صحابۂ کرام کے درمیان تفریق کرنا درست نہیں۔ کسی بھی صحابی یا صحابیہ کا تمثیلی کردار پیش کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ایسا کرنے سے ان کی عظمت اور احترام میں کمی آتی ہے اور ان کی پاکیزہ شخصیات مجروح ہوتی ہیں۔ (کویت کے ہفت روزہ المجتمع نے اس مباحثے کو اپنے شماروں: ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۹-۲۶ر ربیع الاول ۱۴۲۵ھ، ۸-۱۵رمئی ۲۰۰۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۲۰۰۵ء میں 'صحابۂ کرام کی اداکاری- شریعت کی نظر میں' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔)

راقم سطور کی رائے میں حضور ﷺ کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کے کرداروں کی اداکاری بھی مناسب نہیں ہے۔

طبی اخلاقیات

سوال: طب کے میدان میں ڈاکٹروں، اسپتالوں، تشخیصی مراکز (لیباریٹری وغیرہ) اور دواساز کمپنیوں کا طرز عمل کچھ یوں ہے:

(۱) ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کو مریض حوالے (Refer) کرتا ہے، مگر اس وقت جب دوسرا

ڈاکٹر پہلے ڈاکٹر یعنی حوالے کرنے والے کو اپنے بل کا ۲۰ سے ۳۰ فی صد دے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اسے کیس ریفر نہیں کیے جاتے، بل کہ کئی بار تو اس میں مقابلے کی کیفیت ہوتی ہے، یعنی جو زیادہ دیتا ہے اسے مریض ریفر کیے جاتے ہیں۔ یہ مارکیٹ کا تقریباً طے شدہ اصول ہے اور اس کی ادائی باضابطہ چیک سے ہوتی ہے۔

(۲) تشخیصی مراکز کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ایک ڈاکٹر مخصوص مرکز سے ہی اپنے مریضوں کے ٹسٹ کرواتا ہے، جہاں سے اسے بل کا طے شدہ حصہ ملتا ہے، جو کبھی کبھی ۴۰ فی صد تک ہوتا ہے۔ اس میں عموماً مریض سے جو کچھ لیا جاتا ہے وہ یکساں رہتا ہے۔ ڈاکٹر لے یا نہ لے اور گا ہے ڈاکٹر کے کہنے پر کچھ تخفیف بھی کردی جاتی ہے، جس سے مریض کو تھوڑا فائدہ ہوتا ہے، مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

(۳) دواساز کمپنیاں اپنی مصنوعات کو بڑھاوا دینے کی خاطر اطباء کو کچھ مراعات (مثلاً تحفے جو معمولی سے لے کر کار، بیرون ملک سفر اور دوسرے خاطر خواہ فوائد، جو تجارتی زبان میں Incentives کہلاتے ہیں) دیتی ہیں۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں، بل کہ اس بات کے لیے کمپنیوں میں باضابطہ فنڈ ہوتا ہے۔

(۴) پھر کچھ کمپنیاں کھلے طور سے یہ کہتی ہیں کہ جتنا زیادہ ہماری مصنوعات کو بڑھاوا دیں گے اسی قدر آپ کو زیادہ سے زیادہ Incentive دیا جائے گا۔

(۵) کچھ اطبا دواساز کمپنیوں سے اپنی مشتہری کا کام کرواتے ہیں، جس پر تمام پیسہ کمپنی خرچ کرتی ہے۔ اس کے عوض ڈاکٹر اس مخصوص کمپنی کی مصنوعات تجویز کرنے میں امتیاز سے کام لیتے ہیں۔

ان حالات کے مدِنظر درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

☆ کیا اس طرح کا لین دین، جو ڈاکٹروں کے مابین ہو، یا تشخیصی مراکز اور اطباء کے مابین ہو، جائز ہے یا نہیں؟

☆ کیا دواساز کمپنیوں سے مراعات لی جاسکتی ہیں؟

☆ کیا دواساز کمپنی سے اپنے کاروبار/کسب کے بڑھاوے کے لیے مشتہری کا کام لیا جاسکتا ہے؟

ان امور میں قرآن وسنت کی رہ نمائی مطلوب ہے۔ اللہ آپ کو بہترین بدلہ عطا کرے اور اپنا قرب بخشے۔

جواب: طب کا شمار معزز پیشوں میں ہوتا ہے۔ جو حضرات یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں انھیں سماج میں عزت وجاہ اور مال ودولت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی بھی حاصل ہوتی ہے، اگر وہ اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں اخلاص اور خلقِ خدا کو فائدہ پہنچانا پیشِ نظر رکھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔

(فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، عبدالرؤف المناوی، ۴۸۱/۳)

''سب سے بہتر شخص وہ ہے جس کی ذات سے دوسرے انسانوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔''

یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ معزز پیشہ بھی موجودہ دور میں 'صارفیت' کی نذر ہو گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں، نرسنگ ہومس اور پرائیویٹ اسپتالوں، تشخیصی مراکز اور دوا ساز کمپنیوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ سب ایک دوسرے کے تعاون سے مال ودولت کا ڈھیر لگانے میں جٹے ہوئے ہیں اور مریضوں کے مفاد اور فلاح و بہبود کا معاملہ، جسے سب کے نزدیک بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہیے تھی، پس پشت چلا گیا ہے۔ ان حالات میں مسلم ڈاکٹرس مقاصدِ شریعت اور دین کی بنیادی تعلیمات کی روشنی میں صحیح لائحۂ عمل اختیار کر سکتے ہیں۔

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مقاصدِ شریعت پانچ ہیں: حفظِ جان، حفظِ مال، حفظِ دین، حفظِ عقل، حفظِ نسل۔ (شاطبی، الموافقات فی اصول الشریعۃ المطبعۃ الرحمانیۃ مصر، ۸/۲)

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ۔ (ابوداؤد: ۵۱۲۸، ترمذی: ۲۸۲۲، ابن ماجہ: ۳۷۴۵)

''جس شخص سے مشورہ کیا جائے اسے امانت دار ہونا چاہیے۔''

ایک حدیث میں یہ زرّیں اصول بیان کیا گیا ہے:

لاَ ضَرَرَ وَلاَ ضِرَارَ۔ (موطا امام مالک، کتاب الاقضیۃ، ۳۲۰۰، سنن ابن ماجہ: ۲۳۴۰)

''نہ خود نقصان اٹھایا جائے، نہ دوسرے کو نقصان پہنچایا جائے۔''

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔

(بخاری: ۱۳، مسلم: ۴۵)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

تمام تر طبی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ مریضوں کو فائدہ ہو، وہ جن تکالیف میں مبتلا ہوں ان کا ازالہ ہو، جن امراض کا شکار ہیں وہ دور ہوں اور جن امراض کے لاحق ہونے کا اندیشہ ہو ان سے محفوظ رہیں۔ اس مقصد کے حصول کے دوران ڈاکٹروں، اسپتالوں، تشخیصی مراکز اور دواساز کمپنیوں، سب کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ مریضوں کو غیر ضروری دوائیں نہ دی جائیں، سستی اور کم دواؤں سے کام چل سکتا ہو تو مہنگی اور زیادہ دوائیں نہ لکھی جائیں، بلا ضرورت مختلف ٹیسٹ نہ کروائے جائیں، صرف دواؤں سے مرض دور ہوسکتا ہو تو آپریشن نہ تجویز کیا جائے وغیرہ۔ اگر ان امور کی پوری رعایت کی جائے تو اس کے بعد ڈاکٹروں کے درمیان باہم، یا تشخیصی مراکز اور ڈاکٹروں یا دواساز کمپنیوں اور ڈاکٹروں۔ کے درمیان مالی فوائد اور مراعات کے تبادلے کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں مزید وضاحت کے لیے چند صورتیں درج کی جاتی ہیں:

(۱) ایک ہی دوا مختلف دواساز کمپنیاں مختلف ناموں سے تیار کرتی ہیں، لیکن ان کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے۔ بعض مشہور کمپنیاں اپنی شہرت کی بنا پر زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔ اگر دو دواؤں کے اجزاء اور ان کی تاثیر یکساں ہے، لیکن ایک کی قیمت کم اور دوسری کی قیمت زیادہ ہے تو ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ مریض کا مفاد اپنے سامنے رکھے اور کم قیمت کی دوا اس کے لیے تجویز کرے۔ یہ خیال کرنا کہ مہنگی دوا سے مریض نفسیاتی طور پر

زیادہ مطمئن ہوگا، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے سستی دوا کو چھوڑ کر مہنگی دوا تجویز کرنا غیر اخلاقی فعل ہے۔

(۲) بسا اوقات دو دواؤں کے اجزاء تو یکساں ہوتے ہیں، لیکن ان کے عناصر کے تناسب میں کمی بیشی ہوتی ہے، یا کسی دوا میں مزید ایک عنصر کا اضافہ کردیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی تاثیر بدل جاتی ہے، یا اس میں تیزی آجاتی ہے۔ اس بنا پر بھی ان کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر زیادہ موثر لیکن مہنگی دوا تجویز کرسکتا ہے۔

(۳) اب تشخیص مرض کے لیے ڈاکٹروں کا انحصار مختلف جانچوں اور تفتیشی رپورٹوں پر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس بنا پر حسبِ ضرورت جانچیں کروائی جاسکتی ہیں۔ لیکن بغیر کسی خاص ضرورت کے، محض تشخیصی مراکز کو فائدہ پہنچانے یا ان سے اپنا کمیشن حاصل کرنے کے مقصد سے ڈھیر سی جانچیں لکھ دینا اور مریضوں کو مخصوص مراکز پر بھیجنا طبی اخلاقیات اور دینی اقدار دونوں کے منافی ہے۔

(۴) بعض امراض ایسے ہیں جن کا علاج دواؤں سے ممکن ہے۔ ان کے لیے ڈاکٹر کا آپریشن تجویز کرنا محض اس لیے کہ آپریشن کی صورت میں کسی نرسنگ ہوم کا فائدہ ہو اور اسے آپریشن کی فیس حاصل ہو، جائز نہیں۔

(۵) ایک دوا کم قیمت کی ہے اور اس کی تاثیر بھی کم ہے، یا وہ زیادہ دنوں میں اپنا اثر دکھاتی ہے، جب کہ دوسری دوا نسبتاً مہنگی ہے، لیکن زیادہ مؤثر یا سریع الاثر ہے، ایسی صورت میں ڈاکٹر کا فرض ہے کہ اپنے طبی تجربے کی بنیاد پر فیصلہ کرے کہ مریض کے لیے کم قیمت لیکن دیر میں اثر کرنے والی دوا مناسب ہے، یا مہنگی اور سریع الاثر دوا۔ اس کی رعایت کیے بغیر کسی دوکان دار کا فائدہ کرانے یا اپنا کمیشن بنانے کے مقصد سے مہنگی دوا تجویز کرنا جائز نہیں۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ان سب میں ضروری ہے کہ ڈاکٹر مریض کا مفاد پیش نظر رکھے۔ وہ یہ دیکھے کہ اس کی صحت اور جان کے تحفظ کے لیے دوا بہتر ہے یا آپریشن؟ اور دوا بہتر ہے تو کون سی؟ کس تشخیصی جانچ کی واقعی ضرورت ہے اور کس کی نہیں؟ کن

صورتوں میں مریض کے مال کا ضیاع ہے اور کون سے مصارف حقیقتاً مطلوب ہیں؟ ان امور کو دھیان میں رکھ کر ڈاکٹر اپنے حقوق وفرائض کا تعین کرسکتا ہے۔ یہ اس کے دین وایمان کا بھی تقاضا ہے اور طب کی اخلاقیات میں سے بھی ہے۔

مریض سے مصنوعی تنفّس کے آلات کب ہٹائے جاسکتے ہیں؟

سوال: کسی بھی بیماری کے نتیجے میں جب مریض موت کے قریب پہنچ جاتا ہے تو اس کے جسم کا ایک ایک عضو بے کار ہونے لگتا ہے۔ ایسے میں اس مریض کو مشین (Ventilator) کے ذریعے مصنوعی تنفس دیا جاتا ہے۔ بلڈ پریشر کم ہونے لگے تو اسے نارمل رکھنے کے لیے انجکشن لگائے جاتے ہیں۔ خون میں سوڈیم، پوٹیشیم وغیرہ کی کمی ہوجائے تو ان کو بھی خون کی رگوں میں چڑھایا جاتا ہے۔ ایسا مریض I.C.U (Intensive Care Unit) میں مشینوں اور نلکیوں کے درمیان گھری ہوئی ایک زندہ لاش کی مانند ہوتا ہے۔ طب میں ایک اصطلاح 'دماغی موت' (Brain Death) کی استعمال ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسانی دماغ کو آکسیجن نہ ملے تو چار منٹ کے اندر اس کے اہم حصے (Centers) مرجاتے ہیں۔ دماغی موت کے بعد بھی انسان زندہ رہتا ہے اور کسی بھی ذریعے سے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ دماغ کا کتنا حصہ متاثر ہوا ہے؟ ایسے مریضوں کو اس امید پر کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے، کئی کئی دنوں تک ونٹی لیٹر پر رکھا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے مریض کو، جس کی دماغی موت واقع ہوچکی ہو، ونٹی لیٹر پر رکھنا درست ہے؟ یہ طبی اخلاقیات کا ایک اہم مسئلہ ہے، بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں ایک عام آدمی .I.C.U کا مہنگا علاج زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جہاں .I.C.U میں بستروں اور مشینوں کی پہلے ہی سے کمی ہو، وہاں ایسے مریض کو، جس کی زندگی کی امید تقریباً ختم ہوچکی ہو، کئی کئی دنوں تک رکھا جائے تو نئے آنے والے مریضوں کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی، جب کہ ان پر زیادہ توجہ دے کر ان کی زندگی بچائی جاسکتی ہے۔

بہ راہ مہربانی اس مسئلے کو اسلامی نقطۂ نظر سے واضح فرمائیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی موت کا وقت مقرر کردیا ہے۔ جب وہ آجائے گا تو موت طاری ہونے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ط (المنافقون:۱۱)

''جب کسی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا۔''

پہلے کسی انسان کی موت کا فیصلہ ظاہری علامتوں کو دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ مثلاً اس کی ایک نمایاں علامت آنکھیں پتھرا جانا (کھلی رہ جانا) ہے۔ احادیث میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت ابوسلمہؓ کی وفات کے وقت رسول اللہ ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ان کی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔ آپؐ نے انھیں بند کیا، پھر فرمایا:

اِنَّ الرُّوحَ اِذَا قُبِضَ تَبِعَهُ الْبَصَرُ۔ (مسلم، کتاب الجنائز:۹۲۰)

''جب کسی شخص کی روح قبض ہوجاتی ہے تو اس کے بعد اس کی نگاہ بھی سلب کرلی جاتی ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اَلْاِنْسَانُ اِذَا مَاتَ شَخَصَ بَصَرُهُ۔ (مسلم:۹۲۱)

''انسان کی جب موت ہوجاتی ہے تو اس کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔''

موت کی دیگر علامتوں میں جسم ڈھیلا پڑ جانا اور اس میں کسی طرح کی حس وحرکت کا نہ پایا جانا، سانس رک جانا اور حرکتِ قلب بند ہوجانا بھی ہے۔ جس شخص میں یہ علامتیں ظاہر ہوجاتی تھیں اسے مردہ سمجھ لیا جاتا تھا۔

اب طبی تحقیقات نے موت کی تفصیلی کیفیت اور اس کی جزئیات فراہم کردی ہیں۔ اس کے مطابق بعض امراض مثلاً Heart Attack میں پہلے انسان کا دل اور پھیپھڑے کام کرنا بند کردیتے ہیں (اسے تشخیصی موت Clinical death کہتے ہیں) اس کے نتیجے میں دماغ کو آکسیجن کی سپلائی بند ہوجاتی ہے تو تین سے چھ منٹ کے دوران دماغ کے خلیات کی موت ہوجاتی ہے۔ (اسے دماغی موت (Brain death کہتے ہیں) بعض امراض میں دماغی موت پہلے ہوجاتی ہے۔ تنفس اور حرکتِ قلب کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد جسم کے

مختلف اعضاء کے خلیات بھی مرنے لگتے ہیں۔ بعض اعضاء کے خلیات جلد متاثر ہوتے ہیں اور بعض کے دیر میں۔ (اسے خلوی موت Cellular death کہا جاتا ہے) موت کے معاملے میں ان تدریجی مراحل میں فیصلہ کن مرحلہ دماغی موت کا ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے بعد زندگی کی بنیادی خصوصیات مثلاً ادراک وشعور وغیرہ واپس نہیں آسکتیں۔

وینٹی لیٹر نامی مشین کی ایجاد سے اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کچھ عرصہ تک تنفس کا عمل بحال اور قلب کی حرکات منضبط رکھی جاسکیں۔ اب اگر دماغ کی کارکردگی بالکل ختم ہوگئی ہو اور اس کے خلیات کی موت ہوگئی ہو ـــ اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ مرکزی اعصابی نظام کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اعضائے جسم کی حس وحرکت بالکل مفقود ہوجاتی ہے ـــ تو اس کا مطلب یقینی موت ہے، اس لیے کہ خلیاتِ دماغ کی موت کے بعد زندگی کی بحالی کی کوئی امید نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں وینٹی لیٹر کے استعمال کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دماغی موت کے بعد بھی وینٹی لیٹر کا استعمال جاری رہے تو اس کا فائدہ بس اتنا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے جسم کے مختلف اعضاء کو آکسیجن کی مناسب مقدار پہنچتی رہتی ہے۔ اس طرح دیگر اعضاء کے خلیات کو مرنے سے تو نہیں بچایا جاسکتا، البتہ ان کی موت کے عمل کو سست ضرور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر دماع کی کارکردگی متاثر نہ ہوئی ہو تو زندگی کی طرف واپسی کا امکان باقی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں وینٹی لیٹر کا استعمال ضروری ہوتا ہے، تاکہ دماغی خلیات کو آکسیجن کی فراہمی ہوتی رہی اور ان کی موت نہ ہو۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ جب تک مریض کی، زندگی کی طرف واپسی کی امید قائم ہو اس وقت تک علاج معالجہ میں کوئی کسر نہیں اٹھائی جائے گی اور اس وقت تک مصنوعی تنفس کے آلات کا استعمال کرنا بھی درست ہوگا۔ اس سلسلے میں اللہ کے رسول ﷺ کی عمومی رہ نمائی موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

يَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوُوا فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ دَوَاءً۔

(ترمذی: ۲۰۳۸، ابوداؤد: ۳۸۵۵)

’’اے اللہ کے بندو، علاج کراؤ۔ اس لیے کہ اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں رکھی ہے، جس کا اس نے کوئی علاج نہ رکھا ہو۔‘‘

مرض کے کس مرحلے پر زندگی کی طرف واپسی کا امکان باقی ہے اور کب اس کا امکان ختم ہو گیا ہے اس کے بارے میں فیصلہ کن رائے ماہر طبیب کی ہوگی۔ جب وہ یہ رائے دے دے تو علاجی تدابیر موقوف کی جاسکتی ہیں اور مصنوعی تنفس کے آلات ہٹائے جاسکتے ہیں۔

یہ مسئلہ مختلف ممالک کی فقہ اکیڈمیوں میں زیر غور رہا ہے۔ ماہرین کی تحقیقات اور اصحابِ علم وفقہ کی آراء پر طویل بحث ومباحثہ کے بعد جو قراردادیں منظور کی گئی ہیں ان میں وہی بات کہی گئی ہے جس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان قراردادوں کو نقل کیا جاتا ہے:

تنظیم اسلامی کانفرنس (O.I.C) کے زیر اہتمام قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے تیسرے اجلاس منعقدہ عمان (اردن) ۱۹۸۶ء میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی:

''اگر کسی شخص میں مندرجہ ذیل دو علامتوں میں سے کوئی ایک علامت ظاہر ہو جائے تو شرعاً اسے مردہ تصور کیا جائے گا اور اس پر موت کے تمام احکام جاری ہوں گے:

۱- اس شخص کے دل کی حرکت اور تنفس مکمل طور پر اس طرح رک جائے کہ ماہر اطباء یہ کہیں کہ اب اس کی واپسی ممکن نہیں۔

۲- اس کے دماغ کے تمام وظائف بالکل معطل ہو جائیں اور ماہر اور تجربہ کار اطباء اس بات کی صراحت کریں کہ یہ تعطل اب ختم نہیں ہوسکتا اور اس کے دماغ کی تحلیل ہونے لگی ہے۔

ایسی حالت میں محرک حیات آلات کو اس شخص سے ہٹا لینا جائز ہے، خواہ اس کا کوئی عضو مثلاً قلب، محض آلے کی وجہ سے مصنوعی حرکت کر رہا ہو۔''

(جدید فقہی مسائل اوران کا مجوزہ حل، طبع کراچی، ۲۰۰۶ء ص ۵۲)

رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت قائم، المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ نے اپنے دسویں اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ، ۱۹۸۷ء میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض کے بعد درج ذیل فیصلہ کیا:

''جس مریض کے جسم سے زندگی جاری رکھنے کے آلات لگے ہوں، اگر اس کے دماغ کی کارکردگی مکمل طور پر بند ہو جائے اور تین ماہر وواقف کار ڈاکٹرز اس بات پر متفق

ہوں کہ اب یہ کارکردگی دوبارہ بحال نہیں ہوسکتی ہے تو اس مریض کے جسم سے لگے ہوئے آلات ہٹالینا درست ہے، خواہ ان آلات کی وجہ سے مریض میں حرکتِ قلب اور نظام تنفس قائم ہو، البتہ مریض کی موت شرعاً اس وقت سے معتبر مانی جائے گی جب ان آلات کے ہٹانے کے بعد قلب اور تنفس اپنا کام بند کردیں۔''

(المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے، طبع دہلی ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۱)

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے بھی اس موضوع پر اپنے سولہویں سمینار منعقدہ اعظم گڑھ (یوپی) ۲۰۰۷ء میں غور کیا اور بحث ومباحثہ کے بعد درج ذیل تین قراردادیں منظور کیں:

۱- جب سانس کی آمد ورفت پوری طرح رک جائے اور موت کی علامات ظاہر ہوجائیں تب ہی موت کے واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اسی وقت سے موت سے متعلق وصیت کا نفاذ، میراث کا اجراء اور عدت کا آغاز وغیرہ احکام جاری ہوں گے۔

۲- اگر مریض مصنوعی آلۂ تنفس پر ہو، لیکن ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس نہ ہوئے ہوں اور امید ہو کہ فطری طور پر تنفس کا نظام بحال ہوجائے گا تو مریض کے ورثہ کے لیے اسی وقت مشین کا ہٹانا درست ہوگا جب کہ مریض کی املاک سے اس علاج کو جاری رکھنا ممکن نہ ہو، نہ ورثہ ان اخراجات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور نہ اس علاج کو جاری رکھنے کے لیے کوئی اور ذریعہ میسر ہو۔

۳- اگر مریض آلۂ تنفس پر ہو اور ڈاکٹروں نے مریض کی زندگی اور فطری طور پر نظام تنفس کی بحالی سے مایوسی ظاہر کردی ہو تو ورثہ کے لیے جائز ہوگا کہ مصنوعی آلۂ تنفس علاحدہ کردیں۔

(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، طبع دہلی ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۷)